طلوعِ اسلام

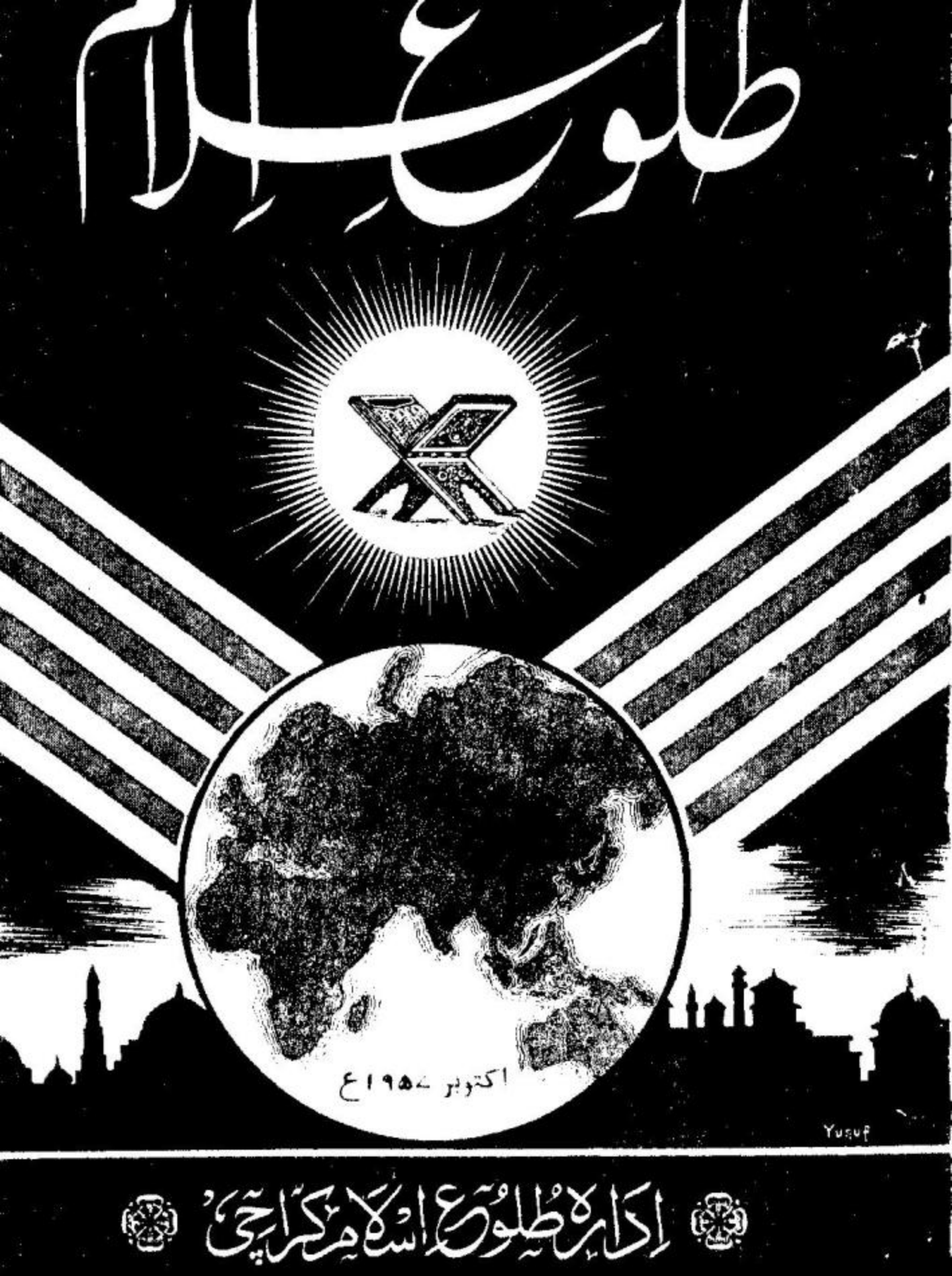

اکتوبر ۱۹۵۷ء

Yusuf

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظام ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ کراچی

بدلِ اشتراک

ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ:۔ آٹھ روپے

غیر ممالک سے سالانہ:۔ ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ

ہندوستان اور پاکستان سے

بارہ آنے

ٹیلی فون:۔ ۴۱۴۸۸

خط وکتابت کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۱۵۹-ایل ۳ (پی۔ای۔سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی

جلد ۱۰ | اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء | نمبر ۱۰

فہرست مضامین

لمعات ۲—۶

طلوعِ اسلام کنونشن ۷—۸

تقریب جشنِ عید میلاد النبیؐ ۹—۲۱

(محترم پرویز صاحب)

قرآن اور تاریخ ۲۲—۳۵

(محترم پرویز صاحب)

مجلسِ اقبال ۳۶—۴۸ و ۶۷

اسلام کی سرگزشت (محترم ڈاکٹر احمد امین مصری) ۴۹—۵۶

حقائق و عبر ۵۷—۵۹

نقد و نظر ۶۰—۶۵

قرآنی معاشرہ (محترم عمر احمد صاحب عثمانی) ۷۰—۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن نے مسلمانوں کو اُمّتِ واحدہ بنا دینے کے بعد واضح الفاظ میں تنبیہ کردی تھی کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۔ دیکھنا! اس وحدت و یگانگت کے بعد ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنھوں نے واضح حقیقت آجانے کے بعد پھر آپس میں تفرقہ پیدا کرلیا اور لگے اختلاف کرنے۔ اور اس کے بعد انھیں بتا دیا کہ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۴)۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اس سے کسی اور کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ خود تم پر سخت تباہی آجائے گی۔ یہ اور اس قسم کی بیسیوں آیات سے ظاہر ہے کہ اسلام اور تفرقہ، مسلمان اور باہمی اختلافات، دو متضاد چیزیں ہیں جو بیک وقت اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ اگر فرقہ سازی اور پارٹی بازی ہے تو اسلام نہیں۔ اگر باہمی تشتت و اختلافات ہے تو مسلمان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام جسے قرآنی فکر و نظام کے نقیب ہونے کا شرف و سعادت حاصل ہے، پہلے دن سے مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کے اس قدر مخالف ہے اور یہ کوشش کر رہا ہے کہ وہ جو تفرقے اور اختلافات مٹ کر کسی طرح اُمّت میں وحدت اور اتفاق پیدا ہوجائے۔

پاکستان کا مطالبہ درحقیقت اسی وحدتِ ملّت کی حقیقت (یا کم از کم آرزو) کا مظاہرہ تھا۔ یہاں کے بسنے والے مسلمانوں نے اعلان کیا تھا کہ ہم (بربنائے دین) ایک قوم ہیں اور اپنے لئے ایک خطۂ زمین چاہتے ہیں جس میں اپنے تصورات کے مطابق (جن میں کوئی اختلاف نہیں) اپنی حکومت قائم کرسکیں۔ پاکستان بن گیا لیکن اس کے ساتھ ہی چشمِ فلک نے عجیب تماشا دیکھا کہ وہی ارباب بست و کشاد جو "واہگہ" کی سرحد تک اُمّتِ واحدہ کے نعرے بلند کرتے چلے آرہے تھے، سرزمینِ پاکستان پر قدم رکھتے ہی افتراق و اختلاف کی سازشوں میں مصروف ہوگئے۔ [ہم نے خاص طور پر "ارباب بست و کشاد" اس لئے کہا ہے کہ ہمارے مطالعہ کے مطابق، پاکستان کے عوام کے دل میں کبھی اختلاف و افتراق کے جذبات از خود پیدا نہیں ہوئے۔ یہ سب انہی "ارباب حل و عقد" کے پیدا کردہ اور بیدار کردہ ہیں]۔ ہمارے ہاں مذہبی فرقے تو پہلے سے موجود تھے۔ پاکستان پہنچ کر سیاسی تفرقوں نے از سرِ نو انگڑائیاں لینی شروع کردیں۔ اس کے ساتھ ہی یہاں سرحدی، پنجابی، سندھی، بلوچی، بنگالی اور غیر بنگالی کے مذموم اور یکسر غیر اسلامی جذبات کو بھڑکایا جانے لگا۔ اس شعلہ ریزی کو سب سے زیادہ ہوا اُس منحوس اور تباہ کن فیصلے نے دی جس کی رُو سے ملازمتوں وغیرہ میں باقی

تناسب قائم کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ آگ اس قدر تیز اور اس کے شعلے اتنے بلند ہو گئے کہ خود پاکستان کی سالمیت خطرہ میں پڑ گئی۔ اس تباہی سے بچنے کے لئے، طلوع اسلام نے ۱۹۵۲ء میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر بہ حالات موجودہ، جغرافیائی بُعد اور دیگر موانع کے پیش نظر مشرقی اور مغربی پاکستان میں سردست وحدت پیدا کرنا مشکل ہے۔ اور یہ مشکل محض ذہنی نہیں واقعی ہے، تو کم از کم، مغربی پاکستان کے صوبوں کو مٹا کر "ایک وحدت" قائم کر دی جائے۔ بللہ الحمد کہ یہ تجویز کامیاب ہو گئی اور ایک وحدت (ONE - UNIT) کی تشکیل ہو گئی۔

"ایک وحدت" کی تشکیل ہونے کو تو ہو گئی لیکن اس کی زمین میں بھی اسی شجرۃ الذقوم کا بیج رکھ دیا گیا جس نے پاکستان بھر میں اختلاف و افتراق کے کانٹے بکھیر دیئے تھے۔ یعنی مغربی پاکستان کے خطہ کی وحدت تو تسلیم کر لی گئی لیکن ملازمتوں اور اسمبلی میں بٹے ہوئے صوبوں کے تناسب کو برقرار رکھا گیا۔ بالفاظ دیگر، اسلام کے بعد بھی عصبیت جاہلیہ کے بتوں کی پرستش بدستور ہوتی رہی۔ "ون یونٹ" میں ملک اور قوم کا تو ہر پہلو سے فائدہ تھا۔ لیکن ہمارے لیڈر اس میں اپنا سخت ذاتی نقصان دیکھتے تھے۔ اگر "ایک وحدت" کی بجائے مختلف صوبے برقرار رہتے تو ایک اسمبلی کی بجائے تین چار اسمبلیاں ہوتیں۔ پھر اسی نسبت سے وزارتیں بنتیں۔ اتنے ہی وزرائے اعظم ہوتے۔ دولت ملتی۔ مناصب و مدارج حاصل ہوتے۔ ہوسِ اقتدار کی تسکین ہوتی۔ عیش سامانیوں کی فراوانی ہوتی۔ جب محرومیین کے اس گروہ کو ان لذتوں کی یاد ستاتی تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ چنانچہ انھوں نے اس ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں، "ون یونٹ" کو ختم کرنے کے لئے ہر ممکن سازش کر ڈالی اور۔ وائے بر ما و بر قوم ما۔ کہ آخر یہ اس میں کامیاب ہو کر رہے اور اتحاد و اتفاق کی طرف جو ایک ہلکا سا قدم اٹھا تھا اسے بھی پیچھے ہٹا دیا گیا۔ اس وقت 'مغربی پاکستان اور مرکز میں' تین پارٹیاں زیادہ مؤثر ہیں۔ ری پبلیکن، (نوزائیدہ) نیشنل عوامی پارٹی اور مسلم لیگ۔ ان میں سے اول الذکر دو پارٹیوں نے اس وحدت کشی میں شمشیر برہنہ سے کام لیا اور مسلم لیگ کی مداہنت نے خنجر زیر آستین کا حربہ استعمال کیا۔ ملک اور قوم کی اس تباہی اور بربادی میں یہ سب برابر کے شریک اور یکساں مجرم ہیں۔ ان کے سامنے نہ قوم کا مفاد ہے نہ ملک کی سلامتی کا خیال۔ ان کے پیش نظر صرف ذاتی مفاد کا حصول اور ہوسِ اقتدار کی تسکین ہے۔ جن لوگوں کے کیریکٹر اور دیانت کا یہ عالم ہو، ان سے ملک اور قوم کے نام پر کچھ اپیل کرنا بالکل بے سود ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تباہی کا علاج کیا ہے؟ ہماری مملکت آئینی ہے۔ لہٰذا اس مصیبت سے چھٹکارا بھی آئینی طور پر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آئینی تبدیلیوں کے لئے ضروری ہے کہ عوام میں صحیح خیالات کو عام کیا جائے۔ اس قدر عام کہ ساری فضا ان خیالات سے معمور ہو جائے اور ہر شخص، شعوری اور غیر شعوری طور پر ان سے متاثر۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ وہ کون سے خیالات ہیں جنھیں "صحیح" قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ یہاں ہر فرقہ اور ہر پارٹی اپنے اپنے خیالات کو صحیح قرار دیتی ہے؛ دوسروں کے لئے تو اس کا جواب مشکل ہو گا لیکن مسلمانوں کے لئے اس میں ذرا بھی دشواری نہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان ہے کہ صحیح وہ ہے جو احکام خداوندی کے مطابق ہو اور غلط وہ ہے جو ان کے خلاف ہو۔ جہاں تک مسئلہ زیر نظر کا تعلق ہے،

اس باب میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ احکامِ خداوندی کی رو سے اُمت میں تفرقہ اور اختلاف (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کے رنگ میں۔ خواہ وہ نسلی تفریق کی بنا پر ہو اور خواہ صوبائی تقسیم کی جہت سے) بہر حال و بہر کیف خلافِ اسلام ہے۔ لہذا ہر وہ قدم جو ان تفرقیات اور اختلافات کو مٹانے کے لئے اٹھایا جائے گا، اسلامی تقاضوں کے مطابق ہوگا اور جو کوشش ان اختلافات کے پیدا کرنے یا انہیں برقرار رکھنے (اور محکم بنانے) میں ممد و معاون ہوگی وہ بہر حیث خلافِ منشائے اسلام ہوگی۔

اس لئے اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ اصل مشکل یہ ہے کہ جن لوگوں کا مفاد ہی افتراق و اختلاف میں پوشیدہ ہے، وہ اس تمام اقرار و اعتراف کے باوجود (کہ افتراق و اختلاف خلافِ تقاضائے اسلام ہے) ہر ایسی کوشش کی مخالفت کریں گے (اور سخت ترین مخالفت) جو ان اختلافات کو مٹانے کے لئے کی جائے گی۔ اس کی بین مثال خود طلوعِ اسلام کے خلاف مخالفت کا طوفان ہے جو ایک عرصے سے برپا کیا جا رہا ہے۔ طلوعِ اسلام کا جرم اس کے سوا کیا ہے کہ یہ فرقہ بندی اور گروہ سازی کو اسلام کے خلاف قرار دیتا ہے۔ ان حضرات میں (جو اس کی مخالفت کرتے ہیں) اتنی جرأت تو ہو نہیں سکتی کہ وہ، یہ کہہ کر مخالفت کریں کہ طلوعِ اسلام فرقہ بندی اور گروہ سازی کو کیوں بُرا کہتا ہے۔ اس سے تو کوئی ایک شخص بھی ان کا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ اس مخالفت کو ایسے نقابوں میں چھپا کر سامنے آتے ہیں جن سے عوام کے جذبات کو آسانی سے مشتعل کیا جا سکے۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں محض مفروضہ کی بنا پر نہیں کہہ رہے۔ دلائل و شواہد کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ مثلاً (ماضی کو چھوڑیئے اور صرف اس ایک واقعہ کو لیجئے جسے آجکل بڑی شد و مد سے آگے بڑھایا جا رہا ہے یعنی) پرویز صاحب کی لاکمیشن میں شمولیت کا واقعہ۔

لاکمیشن کی تشکیل کے فوری بعد، جمعیت العلماء (مغربی پاکستان (لاہور)) کی طرف سے اعلان ہوا کہ اس میں خلافِ اسلام عناصر کو شامل کیا گیا ہے اس کی تصریح کے لئے (مولانا) احمد علی صاحب، صدر جمعیت کا ایک بیان (نوائے پاکستان مورخہ ۲۲ اگست میں) شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے فرمایا کہ "مسٹر غلام احمد پرویز منکرِ حدیث ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا حمید الدین فراہی کے شاگرد ہیں جو معروف منکرِ حدیث تھے۔ مسٹر پرویز وہ بزرگ ہیں جنہوں نے فرمایا تھا کہ قرآن مجید میں ایک آیت بھی اس قابل نہیں کہ اس سے انسانوں کا دستور مرتب کیا جائے۔" ان کے ان خلافِ اسلام نظریات کے خلاف ملک بھر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی" اسی خیالات کا اظہار دوسرے مذہبی گوشوں کی طرف سے بھی ہوا۔ مثلاً یکم ستمبر کے نوائے پاکستان میں اسلامیان شیخوپورہ کی ایک قرارداد شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ

> مسٹر غلام احمد پرویز اور مسٹر امین احسن اصلاحی صاحب دو ایسی ہستیاں ہیں جو منکرینِ حدیث میں خاص مقام رکھتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں مخالفت کا جو طوفان اٹھایا گیا اس کا رُخ تنہا پرویز صاحب کی طرف رہا۔ اس میں نہ (معینہ) "منکرِ قرآن" کو شامل کیا گیا، نہ (دوسرے) منکرِ حدیث (جناب اصلاحی صاحب) کو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پرویز صاحب کی یہ مخالفت "انکارِ حدیث" کی بنا پر نہیں ہو رہی۔ اس کا اصلی سبب کچھ اور ہے۔

ضمناً یہ بھی دیکھتے جایئے کہ جس شخص کو منکرِ شانِ رسالت اور منکرِ حدیث اور ایک نئے فرقے کا بانی قرار دیا جا رہا ہے، اس کے

عقائد کیا ہیں۔ جہاں تک رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کا تعلق ہے، یہ شخص (سیرت نبوی پر اپنی ضخیم تصنیف معراجِ انسانیت میں) لکھتا ہے۔

اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

(معراجِ انسانیت صفہ)

احادیث کے متعلق جس کا اعلان یہ ہے کہ

جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے، ہم انہیں صحیح مانتے ہیں۔ (بادۂ زندگی صفہ)

اور اسلامی احکام و ارکان (نماز۔ روزہ وغیرہ) کے متعلق جس کا مسلک یہ ہے کہ

امت کے مختلف فرقے جس جس انداز سے ان پر عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے۔

(بادۂ زندگی صفہ)

وہ اُمت کے اختلافات مٹانے کے لئے اسلامی حکومت کا قیام ضروری سمجھتا ہے۔ وہ پاکستان کی موجودہ حکومت کو اسلامی نہیں قرار دیتا۔ صرف اس حکومت کو اسلامی کہتا ہے جو "علیٰ منہاجِ نبوت" (یعنی خلافتِ راشدہ کے نقشِ قدم پر) قائم ہو۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ پرویز صاحب کی مخالفت کی وجہ ان کا "منکرِ حدیث" ہونا نہیں۔ (کیونکہ جس شخص کے یہ عقائد ہوں اسے منکرِ حدیث کیسے کہا جا سکتا ہے؟) اس کی وجہ کچھ اور ہے۔

اس مخالفت کا ایک دلچسپ پہلو اور بھی ہے۔ پاکستان لاء کمیشن گیارہ افراد پر مشتمل ہے۔ (دس ممبر اور ایک صدر)۔ ان گیارہ میں ایک پرویز صاحب ہیں۔ اس کمیشن کا کام صرف اتنا ہے کہ یہ سفارشات کرے کہ موجودہ قوانین کو کتاب و سنت سے تطبیق کس طرح دی جا سکتی ہے۔

لاء کمیشن کی یہ سفارشات، پاکستان کی مجلس قانون ساز کے سامنے پیش ہوں گی۔ یہ مجلس ان سفارشات میں سے جسے چاہے گی اُسے قانونی حیثیت دیدے گی۔ اس مجلس میں ایک خاصی تعداد غیر مسلموں (ہندوؤں اور عیسائیوں) کی بھی ہوگی۔

اُس لاء کمیشن کو جس کا کام صرف سفارشات کرنا ہے، ایک ایسے شخص کی موجودگی کی وجہ سے جس سے اِن حضرات کو عقیدہ کا اختلاف ہے غیر اسلامی قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن اُس اسمبلی کو جس نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کون سے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہیں، اسے نئے

لہ اس کتاب کا ایک باب، چند صفحات بعد آپ کے سامنے آئے گا اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ کیا اس کا مصنف واقعی منکرِ حدیث اور منکرِ شانِ رسالت ہے؟

غیر مسلموں کی شرکت کے باوجود، غیر اسلامی قرار نہیں دیا جا رہا اور اس کے خلاف ایک حرف تک بھی زبان تک نہیں لایا جاتا ؟ (اس اسمبلی کو اگر کسی نے غیر اسلامی کہا ہے تو وہ یہی پرویز ہے!!)

اس سے بھی آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ یہ مخالفت "کتاب و سنت" کی محبت کی بنا پر نہیں کی جا رہی۔ اس کے پیچھے جذبہ کوئی اور کار فرما ہے۔ اور وہ جذبہ صرف یہ ہے کہ یہ شخص فرقوں کے وجود کو خلافِ اسلام کیوں قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ ان فرقوں کے مٹ جانے سے ان حضرات کی اپنی ہستی باقی نہیں رہتی، جس طرح پارٹیوں کے مٹ جانے سے، پارٹی لیڈروں کا وجود باقی نہیں رہتا۔

یہ ہے پاکستان کا اصلی روگ اور یہ ہے اس کا علاج۔ اگر آپ اس ملک کی سلامتی اور اس میں اسلام کا فروغ چاہتے ہیں تو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) کرنے کا کام یہ ہے کہ اس خیال کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے کہ افتراق اور اختلاف۔ خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کے رنگ میں۔ خواہ وہ نسلی بنیادوں پر ہو اور خواہ صوبائی تقسیم کی وجہ سے۔ بہر صورت اسلام کے خلاف ہے اور جو شخص اور جو جماعت فرقہ سازی اور گروہ بندی کی حمایت کرتی ہے وہ نہ ملت کی نمائندہ ہو سکتی ہے نہ اسلام کی دوست۔ اگر آپ نے اس خیال کو عام کر دیا تو اس کے مبارک اور مسعود نتائج آپ اپنے سامنے دیکھ لیں گے۔ طلوعِ اسلام اپنی زندگی کو اسی مقصد کے لئے وقف کر چکا ہے۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

لیکن یہ تو مرض کا وہ علاج ہے جس میں وقت لگے گا۔ سوال یہ ہے کہ ملک میں تشتت و انتشار کے جو شعلے اس وقت بھڑک رہے ہیں ان کا فوری مداوا کیا ہے ؟ اگر ہم جذبات سے الگ ہٹ کر سوچیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ دس سال کے تجربے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ جب زمامِ حکومت نا اہلوں اور بے کرداروں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو مملکت کا کیا حشر ہو جاتا ہے۔ اس تجربہ سے اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ خود ارباب حکومت ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ ایک ہی پارٹی کا ایک لیڈر کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ۔ ایک ہی کیبنٹ کا ایک وزیر ایک طرف کو جاتا ہے، دوسرا دوسری طرف کو۔ وزیرِ اعظم کچھ کہتا ہے، اور اس کے وزرا کچھ اور۔ مرکز سے ایک حکم نافذ ہوتا ہے اور صوبہ کا چیف منسٹر اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس صورتِ حالات کو کچھ عرصہ کے لئے اسی طرح رہنے دیا گیا تو حکومت کی مشینری میں انارکی پھیل جائے گی۔ لہٰذا حالات ہمیں خود بخود اس منزل تک لے آئے ہیں جہاں اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ اس "جمہوری تماشے" کو ختم کر کے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جائے اور نظم و نسق کو فوج کے مستحکم ہاتھوں میں دیدیا جائے تاکہ انتخابات پُر امن اور منظم فضا میں تکمیل تک پہنچ سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ اگر انتخابات کے لئے فضا پُر امن ہو گئی تو ہمارے عوام ان لیڈروں میں سے تو کسی کو ووٹ نہیں دیں گے جنھوں نے ملک کو اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔ ہمارے نزدیک موجودہ حالات پر قابو پانے کے لئے اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں۔

طلوعِ اسلام کنونشن

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

یہ آخری پرچہ ہے جو کنونشن سے پہلے آپ تک پہنچ سکے گا۔ اس لئے اس میں آخری ہدایات درج ہیں انھیں غور سے دیکھ لیں۔

(۱) کنونشن ۱۸۔۱۹۔۲۰ اکتوبر (جمعہ۔ ہفتہ۔ اتوار) راولپنڈی میں منعقد ہوگی۔ چونکہ کنونشن کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے اسلئے جن احباب کو مدعو کیا گیا ہے۔ وہ بلا تامل اس میں شرکت کر سکتے ہیں۔

(۲) کنونشن۔ بنگلہ نمبر 3/114۔ مارکیٹ روڈ۔ صدر۔ راولپنڈی چھاؤنی میں منعقد ہوگی۔ یہ جگہ پنجاب ٹرانسپورٹ سروس (صدر) کے اڈہ کے قریب واقع ہے۔ اس اڈہ سے مارکیٹ کی طرف رخ کر کے قریب نصف فرلانگ کے بعد دائیں ہاتھ کی طرف مارکیٹ روڈ پر مڑ جائیں (اس روڈ کے ساتھ ساتھ ایک گندہ نالہ جاتا ہے) مارکیٹ روڈ سے جلسہ گاہ کے نشانات نظر آجائیں گے۔

(۳) جو حضرات بذریعہ ٹرین تشریف لائیں وہ اسٹیشن پر اتر کر پنجاب ٹرانسپورٹ سروس کے اڈہ کی طرف آئیں۔ یہی جلسہ گاہ کی طرف سیدھا راستہ ہے۔ یہ اڈہ اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں۔

(۴) ۱۷ اکتوبر (بروز جمعرات) رضاکاران بازو پر "طلوع اسلام کنونشن" کا نشان لئے ریلوے اسٹیشن اور اڈہ پنجاب ٹرانسپورٹ سروس (صدر) پر موجود ملینگے۔

(۵) کنونشن کے دوران میں کیمپ لائف ہوگی یعنی دن رات وہیں قیام رہے گا۔

(۶) جمعرات کی شب سے اتوار کی دوپہر تک رہائش اور خورد و نوش کا انتظام بزم طلوع اسلام راولپنڈی کے ذمے ہوگا جسکے لئے تمام شمولیت کنندگان (نمائندگان اور مبصرین) کو بارہ روپیہ فی کس ادا کرنا ہوگا۔ یہ روپیہ جلسہ گاہ کے دفتر میں داخلہ کے وقت وصول کیا جائیگا۔ رقم پیشگی نہ بھیجیے۔

(۷) کنونشن میں شرکت کرنیوالے تمام احباب کو (نام بنام) دعوت نامے بھیجے جائیں گے۔ بزموں سے متعلق احباب کو متعلقہ بزم کی معرفت اور دوسرے احباب کو براہِ راست۔

(۸) کوئی صاحب۔ خواہ وہ کسی بزم کے رکن ہوں یا عہدیدار۔ یا ویسے ہی اس تحریک سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ دعوت نامہ کے بغیر کنونشن میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ اس میں کسی کیلئے استثنا نہیں ہوگی۔ دعوت نامہ کا ہمراہ لانا نہایت ضروری ہے۔ اسے گیٹ پر چیک کیا جائیگا۔

(۹) نمائندگانِ بزم اپنے ہاں کی بزم کے ترجمان سے (دعوت نامہ کے علاوہ) اپنی نمائندگی کا ایک تعارفی خط بھی اپنے ہمراہ ضرور لائیں۔

(۱۰) تمام مہمانان جن کے نام دعوت نامے جاری کئے جا رہے ہیں۔ اپنی آمد کی اطلاع (حسب ذیل پتہ پر) ۱۰ اکتوبر تک ضرور بھیجدیں۔ اور وہ خود ۱۷ اکتوبر (جمعرات) کی شام تک جلسہ گاہ میں ضرور پہنچ جائیں۔

(۱۱) وسط اکتوبر میں راولپنڈی میں کافی سردی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ رہائش شامیانے کے نیچے ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ احباب

گرم بستر (ایک لحاف اور دو کمبل) اور گرم کپڑے (گرم کوٹ اور سویٹر) اپنے ساتھ لائیں۔

خط و کتابت کا پتہ:۔ سکریٹری بزم طلوع اسلام۔ "الکوثر" بالمقابل گورنمنٹ زنانہ کالج۔ مری روڈ۔ راولپنڈی۔

ایجنڈا۔ تفصیلی ایجنڈا کنونشن کے وقت مرتب کیا جائیگا۔ اجمالی (اور مشروط طور پر) یوں سمجھ لیجئے کہ

(۱) جمعرات (۱۷ اکتوبر) بعد نماز عشا۔ تعارفی اجلاس ہوگا۔

(۲) جمعہ (صبح) (۱۸ اکتوبر) مختلف خطبات۔ معہ خطبہ محترم پرویز صاحب۔ (نماز جمعہ پنڈال میں ادا کی جائے گی)

(۳) جمعہ (سہ پہر اور شب) اور ہفتہ کی صبح۔ مختلف تجاویز پر غور اور فیصلے۔ اور محترم پرویز صاحب کا تبصرہ۔

(۴) ہفتہ (۱۹ اکتوبر)۔ بعد نماز ظہر۔ احباب کی نجی مجلس جس میں محترم پرویز صاحب پیش کردہ استفسارات کا قرآنی روشنی میں جواب دیں گے۔

(۵) ہفتہ شب۔ بعد نماز عشا۔ مجلس معارف القرآن۔

(۶) اتوار (۲۰ اکتوبر)۔ صبح۔ پرویز صاحب کی عام تقریر۔ دوپہر۔ الوداعی اجتماع۔

تمام بزمیں نوٹ کرلیں کہ

(۱) جن صاحبان کو وہ اپنا نمائندہ بنا کر کنونشن میں بھیجیں اس کی اطلاع براہ راست سکریٹری بزم طلوع اسلام، راولپنڈی کو قبل از وقت بھیج دیں۔ یہ ضروری ہے

(۲) کنونشن سے پہلے، ہر بزم سال آئندہ کے لئے اپنے نمائندہ کا انتخاب کرے۔ کنونشن کے موقعہ پر ضلع کی بزموں کے نمائندے اپنے میں سے ایک کو (سال آئندہ کے لئے) ضلع کا ترجمان منتخب کرینگے۔ انتخابات جمعہ (۱۸ اکتوبر) بعد نماز جمعہ ہو جائیں گے۔

مختلف اضلاع کے ترجمان حضرات کا ایک خصوصی اجلاس ہوگا جس میں محترم پرویز صاحب لائحہ عمل اور طریق کار کے متعلق ضروری ہدایات دیں گے۔

(۳) محترم پرویز صاحب کے خطاب کا پمفلٹ کنونشن میں موجود ہوگا۔ ہر بزم کو جسقدر پمفلٹ مطلوب ہوں وہ اپنے نمائندہ کو اسکی بابت ہدایت دیدے۔ نمائندگان کو مطلوبہ تعداد، باخذ نقد قیمت، دیدی جائے گی۔ (اسکی قیمت اندازاً ۲ آنہ فی کاپی ہوگی)

(۴) اس مرتبہ بزموں کی ماہانہ کارروائی کی روئداد (عدم گنجائش کی وجہ سے) شائع نہیں کی جارہی۔ بزموں کے نمائندے اپنی اپنی رپورٹ کنونشن میں لے آئیں۔ نئی بزمیں اپنے اپنے ضلع کی بزم کے سکریٹری صاحب سے رابطہ قائم کریں۔

(۵) وقت کی کمی کی وجہ سے، اب تمام بزمیں اپنی تجاویز براہ راست سکریٹری بزم طلوع اسلام۔ راولپنڈی کو بھیجیں۔ اور کنونشن کے سلسلہ میں بھی انہی سے براہ راست خط و کتابت کریں۔

بتقریب

جشنِ عیدِ میلاد النبی علیہ التحیۃ والسلام

"خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہدیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اسکے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو"

(معراجِ انسانیت۔ از پرویز)

(معراج انسانیت، مصنفہ پرویز صاحب کا آخری باب)

تکمیلِ کار

طوبیٰ لکم و حسن مآب

اب ہم سنہ ۱۱ھ میں آپہنچے ہیں۔ حیاتِ نبوی کی کتابِ مقدس کے تیئیس اوراق پیچھے کو لوٹئے اور ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالئے ان تمام احوال و ظروف اور کوائف و حوادث پر جو اس داستانِ اطہر و اقدس کے اجزاء و عناصر ہیں۔ دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس پوری داستانِ حیات میں کس طرح زندگی اپنی انتہائی تابانیوں اور ضو فشانیوں، سرگرمیوں اور حرارت آمیزیوں، جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں، سیرابیوں اور شادابیوں، کامرانیوں اور کامجوئیوں، ناپیداکنار وسعتوں اور بے پایاں گہرائیوں کے ساتھ مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ زندگی کیا ہے؟ ایک کاروانِ ذوق و شوق ہے جو یقینِ کامل اور ایمانِ محکم، حسنِ عمل اور جوششِ کردار، تطہیرِ فکر اور پاکیزگیٔ نگاہ، کشادہ ظرفی اور بلند نگہی، سوز و ساز اور تپش و خلش کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے ہوئے انتہائی جذب و انہماک کے ساتھ، اپنے دامن کشیوں سے بے خبر اور گرد و پیش کی عناں گیریوں سے بے نیاز، اپنی متعین منزل کی طرف مستانہ وار بڑھے چلا جا رہا ہے۔ نہ راستے کے خطرات اس کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرتے ہیں، نہ سفر کی صعوبات اس کے پائے استقامت میں لغزش کے آثار نمودار کرتے ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں زندگی نہیں، ایک جوئے رواں ہے کہ نامساعدتِ حالات و ناموافقتِ زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی موجوں میں مزید خوش خرامی پیدا کر دیتی ہے۔

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود	مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار
در خوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب	وا کرد چشمِ شوق باغوشِ کوہسار
از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ او	سیمائے او چو آئنہ بے رنگ و بے غبار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ جوئے رواں نہ صرف ہجومِ تزاحم اور انبوہِ تصادم کی سنگلاخ زمینوں ہی سے مستانہ وار گذرتی آئی ہے بلکہ کشش و جاذبیت کی ہر وادی

رنگ و نشاط اور امیال و عواطف کے ہر دامنِ کیف و نکہت پر ایک نگہ تبسم آلود ڈالتی کج کلہانہ انداز سے آگے بڑھتی چلی آتی ہے۔

در راہِ او بہار پری خانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیش ما بایست — خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
نا آشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش — صحرا بریدہ سینۂ کوہ و کمر درید
زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

غور کیجئے۔ ایک یتیم۔ غریب۔ ان پڑھ انسان، روزمرہ کے کاروبارِ حیات میں مشغول دکھائی دیتا ہے کہ یکایک حقیقت اپنا نقاب الٹ کر بے حجابانہ اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی میں بس اتنا حصہ مافوق الفطرت ہے۔ وہ نیرِ حقیقت کی روشنی میں جب اپنے گرد و پیش پر غور کرتا ہے تو کائناتِ انسانیت کی کوئی شے اسے اپنی صحیح حالت پر نظر نہیں آتی۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ حقیقت کی اس پردہ کشائی سے مقصود یہ ہے کہ وہ اس بگڑی ہوئی دنیا کی ہر شے کو اس مقام پر لے آئے جو فطرت نے اس کے لئے متعین کر رکھا ہے۔ وہ اسے اپنی زندگی کا مقصد اور نگاہوں کا منتہیٰ قرار دے لیتا ہے۔ چونکہ وہ دنیائے انسانیت کے ہر شعبے میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے ساری دنیا اس کی مخالف ہو جاتی ہے۔ وہ اس وسیع و عریض دنیا میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے کوئی اس کا شریکِ فکر نہیں۔ کوئی ہمنوا اور محرم راز نہیں۔ وہ اپنی آواز بلند کرتا ہے تو دنیا بھر کا شور چاروں طرف سے امنڈ آتا ہے کہ اس کی اس دعوت کو کسی باہوش کے کان تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ لیکن وہ اپنی پکار کو برابر جاری رکھتا ہے۔ اس کے پاس کچھ ساز و سامان نہیں۔ کوئی وسائل و ذرائع نہیں۔ لیکن اسے اپنے نصب العین کی صداقت پر ایسا محکم یقین ہے کہ بے سر و سامانی کا ہر حوصلہ شکن مرحلہ اس کے لئے ہزار ساز و یراق بن جاتا ہے اور وہ انتہائی مایوسیوں میں گھرے ہونے کے باوجود نہایت عزم و استقلال سے پکار کر کہتا ہے کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از فزونِ عشق
سود است در سرم کہ بہ ساماں برابر است

سعید روحیں اس کی اس دعوت میں حقیقت و صداقت کی جھلک پاتی ہیں اور اس طرح وہ ایک سے دو اور دو سے چار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ کامل تیئیس برس اسی تگ و تاز اور اسی جد و جہد میں گزر جاتے ہیں۔ اس تمام عرصہ میں اس مدعی حق و صداقت کی زندگی دامنِ صحرا کی طرح ہر رہ نوردِ منزلِ ہستی کے سامنے کھلی ہوئی رہتی ہے۔ کوئی سازش نہیں۔ کوئی راز نہیں۔ کوئی سر مستور نہیں۔ کوئی مافوق العادت عنصر نہیں۔ لین دین۔ میل جول۔ بود و ماند۔ سب اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی طرح۔ دشمن سے لڑائی ہے تو اس کے لئے پوری پوری تیاری کی جاتی ہے۔ شمشیر و سنان۔ تیر و تفنگ۔ آلات و اسلحہ سب مہیا کئے جاتے ہیں۔ جنگ کے میدانوں میں کامیابیاں بھی ہوتی ہیں اور ناکامیاں بھی۔ کامیابیاں مستقل لیکن ناکامی بالکل عارضی۔ اس لئے کہ ایک ناکامی سے اس کے اسباب و وجوہات پر غور کر کے آئندہ کے لئے اس کی تکرار کے امکانات کو زائل کر دیا جاتا ہے۔ اپنی جماعت کی تنظیم بھی ہو رہی ہے اور اس تنظیم میں ان کی تعلیم و تربیت

بھی۔ اسی تعلیم و تربیت سے ان کی سیرتوں کو بلند اور کیرکٹر کو پختہ کیا جاتا ہے۔ مخالفین کی قوت ٹوٹتی جاتی ہے اور موافقین کی جمعیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بتدریج۔ رفتہ رفتہ حق وصداقت کا نظام روشنی کی طرح بڑھتا۔ اور ہر غیر فطری آئین سائے کی طرح سمٹتا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آگیا کہ باطل کی ہر قوت سرنگوں ہوگئی اور حق کا ہر سمت غلبہ ہوگیا۔ ملوکیت برہمنیت۔ سرمایہ داری۔ غلامی۔ شخصیت پرستی۔ نسبی تفریق۔ قبائلی تقسیم کے ہر نظام کہن کی بساط الٹ گئی۔ قزاقی۔ غارت گری۔ درندگی۔ خونخواری۔ قماربازی۔ شراب خواری۔ تعصب۔ جہالت۔ کینہ توزی۔ ظلم واستبداد کی ہر روش مٹ گئی۔

دریائے پرخروش ز بند و شکن گزشت | از تنگنائے وادی وکوہ ودمن گزشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را | از کاخ شاہ و بارہ دکشت وچمن گزشت
بیتاب و تند و تیز و جگرسوز و بےقرار | در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ ایک انسان کا ایمان محکم اور عزم راسخ دنیا میں کیا انقلاب برپا کرسکتا ہے۔ تیئیس سال کی مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی وعمل کے بعد اب وہ وقت آگیا کہ اس مقصد عظیم کی تکمیل کا اعلان کیا جائے۔ جس کا آغاز اس بے سروسامانی کے عالم میں ہوا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ اعلان اس محطۂ نشرالصوت (Broad casting Station) سے ہونا چاہیے تھا جو نظام شرف انسانیت کا مرکز تھا۔ اس مقصد کے لئے ۱۰ھ میں حضورؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اس

مکہ کی طرف روانگی

خبر کا عام ہونا تھا کہ سارا عرب ہمرکابی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے امنڈ آیا۔ ذیقعدہ کی چھبیسویں تاریخ حضورؐ مدینہ منورہ سے جانب کعبہ روانہ ہوئے۔ مدینے سے باہر چھ میل کے فاصلہ پر قیام فرمایا۔ دوسری صبح حضورؐ نے احرام باندھا اور بلند آواز سے فرمایا۔

لبیک اللّٰھم لبیک۔ لاشریک لک لبیک۔ ان الحمد والنعمۃ
لک لبیک۔ والملک لاشریک لک

ہم حاضر ہیں۔ اے خدائے بزرگ وبرتر۔ تیرے بندے تیرے حضور میں حاضر ہیں۔ حمد وستائش کی مرکز تیری ہی ذات ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں۔ حکومت صرف تیرے لئے ہے۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہیں

حضورؐ نے یہ کلمات بلند کئے اور سننے والوں نے سنا کہ لبیک اللّٰھم لبیک کی صدائے بازگشت سے تمام دشت وجبل گونج اٹھے کہ یہ کاروان عشق وذوق تمام دامن صحرا پر ریت کے چمکتے ہوئے ذروں کی طرح تا حد نظر پھیلا ہوا تھا۔ تقدیس وتحمید کی ان زمزمہ باریوں سے یہ قافلۂ نور ونکہت منزل بمنزل آگے بڑھتا گیا۔ سینوں میں تڑپتے ہوئے دل۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی فراست۔

پیشانیوں میں مچلتے ہوئے سجدے۔ ذوقِ عبودیت کی متاعِ گراں بہا در آغوش۔ حسنِ عمل کی کامرانیوں اور سعیِ پیہم کی شادکامیوں کی ایک جنت اپنے جلو میں لئے۔ یہ زبدۂ کائنات گروہ۔ یہ عصارۂ روزگار جماعت۔ یہ جیشِ خدا مست۔ یہ عسکرِ خود آگاہ۔ یہ حریت و مساوات کے علم بردار۔ یہ احترامِ انسانیت کے پیغامبر۔ یہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کے زندہ پیکر۔ ذی الحجہ کی چار تاریخ کو صبح کے سہانے وقت۔ تاروں کی خنک حسین چھاؤں میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ جب

مکہ میں داخلہ کعبہ پر نگاہ پڑی تو حضورؐ نے وجد و مسرت کے والہانہ انداز میں فرمایا۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔ لہ الملک ولہ الحمد یحی و یمیت وھو علی کل شیئ قدیر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔

(ہاں! آج اس حقیقتِ کبریٰ کا عملی اعلان ہو رہا ہے کہ) خدا کے سوا کوئی حاکم اور آقا نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ سروری اور ستائش سب اس کے لئے زیبا ہے۔ وہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو موت دیتا ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اس خدائے واحد کے سوا کوئی حاکم نہیں (میرا سر نیاز اس کی بارگاہِ صمدیت میں جھکا ہوا ہے جس نے) اپنا وعدہ (یوں) پورا کیا۔ اس نے اپنے (بے سروسامان) بندے کی مدد کی اور باطل کے تمام جوش و سکر کو شکست دے دی (اور حق کی اس طرح فتح ہوئی)

نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز یہ تمام جمعیتِ اسلامیہ، یہ امت قانتہ، یہ ملت مسلمہ، یہ قدسیوں کی جماعت، عرفات کے میدان میں جمع ہو گئی کہ اپنے امام و مقتدا سے تشکیلِ حکومتِ الٰہیہ کا اعلانِ عظیم اپنے کانوں سے سُن لیں تاکہ اس کے بعد اسے کامل حتم و یقین کے ساتھ دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیں۔ دوپہر ڈھل گئی تو کملؐ کے خیمے سے وہ ذاتِ گرامیؐ جلوہ بار ہوئی جس کے ایمان و عمل کے درخشندہ نتائج اس وقت یوں سامنے ضوفشاں تھے۔ حضورؐ ناقہ پر سوار ہوئے تو تکبیر کے غلغلہ انگیز نعروں سے

خطبہ حجۃ الوداع فضا مرتعش ہو گئی۔ آپؐ نے ناقہ پر سوار وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو قیامِ نوعِ انسانی کے لئے منشورِ بالغہ ہے آپؐ نے فرمایا۔

الا کل شیئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع

(ہاں! جاہلیت کے زمانۂ مظلمہ کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔

اللہ اکبر! یہ اعلان اُس کی طرف سے ہو رہا ہے جسے اِس مقام سے آج سے دس سال قبل ان ہی آئین و دساتیر کے علمبرداروں نے چاروں طرف سے یورش کر کے نکالا تھا۔

اس کے بعد فرمایا۔

ایھا الناس۔ الا ان ربکم واحد۔ وان اباکم واحد۔ الا لا
فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی۔ ولا لاحمر علی اسود
ولا لاسود علی احمر۔ الا بالتقوی۔

اے نوع انسانی (سن رکھو کہ) تمہارا سب کا رب ایک ہے۔ اور تم تمام ایک ہی اصل کی شاخیں ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب

——— غور کیجئے۔ شرفِ انسانیت کی نمود و بالیدگی اور فضیلت آدمیت کے عروج و ارتقا کی راہ میں سب سے بڑے سنگِ راہ۔ انسانوں کی جغرافیائی تقسیم (وطنیت) اور نسبی تفوق (نیشنلزم) کی ابلیسانہ حدود و قیود ہیں۔ اس لئے اس منشورِ حریت و مساواتِ انسانیہ میں سب سے پہلے باطل کے ان ہی انسانیت سوز معیاروں پر خطِ تنسیخ کھینچا گیا۔ اس طرح تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری قرار دے کر شرفِ انسانیت کو باعثِ تکریم اور وجہِ تعظیم بتا دیا گیا جو اتباعِ قوانین الٰہیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس فطری تقسیم کی طرف اشارہ کیا گیا۔ جس کی رو سے انسان دو جماعتوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک وہ جماعت جو ہر انسان کی محکومیت سے انکار کر کے صرف ایک خدا کی حکومت کو جائز تسلیم کرے۔ اور دوسری وہ جماعت جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کے سامنے اپنی گردن جھکا دے۔ خواہ وہ قوانین خود اپنے وضع کردہ ہوں یا دوسرے انسانوں کے مسلط کردہ۔ اول الذکر جماعت (امت مسلمہ) اس یک رنگی اور ہم رنگی، اشتراکِ نصب العین اور وحدتِ مقصد کی بنا پر باہمد گر بھائی بھائی۔ اور اس حقیقت کبریٰ سے انکار کرنے والے تمام انسان کا فر ایک دوسری سوسائٹی کے افراد۔ اس لئے فرمایا کہ

ان کل مسلم اخو مسلم وان المسلمین اخوۃ

یاد رکھو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور اس طرح تمام روئے زمین کے مسلمان رشتۂ اخوت میں منسلک اور سلکِ مودت سے منوط۔

اور یہ رشتۂ اخوت و رابطۂ مودت محض ایک نظری عقیدہ نہیں بلکہ یاد رکھو کہ

ان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا
فی شھرکم ھذا۔ فی بلدکم ھذا۔ الی یوم تلقون ربکم۔

تمہارا خون اور تمہارا مال اور تمہاری آبرو قیامت تک کے لئے ایک دوسرے کے نزدیک اسی طرح محترم ہونی چاہیئے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں وجہِ احترام ہے۔

یاد رکھو۔

لا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم
فیسئلکم عن اعمالکم

کہیں میرے بعد (اختلاف و مرکزیت کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر تشتت و افتراق کی گمراہی نہ اختیار کر لینا کہ خود ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ۔ یاد رکھو تمہیں خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا۔ اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس کرے گا۔

یہ وحدت دیگر بھی صرف تمہارے نظام سے قائم رہ سکے گی۔ اس نظام کی بنیاد ہے قرآن پر۔ اور یہی قرآن ہے جسے میں اپنے بعد تمہارے لئے چھوڑ جاؤں گا۔

انی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہ۔ ان اعتصمتم بہ

کتاب اللہ

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے

وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ!

یہ ہے تمہارے نظام کا ضابطۂ قانون۔ اور اس قانون کو نافذ کرنے والا تمہارا امیر جس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہو گی۔

ان امر علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ ــــ

فاسمعوا لہ واطیعوا

اگر کوئی حبشی بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تمہیں قرآن کے مطابق لے چلے تو اس کی

اطاعت اور فرمانبرداری کرو

اس نظامِ دینی میں ہر رکن کو اس کی اپنی جگہ پر رکھو۔ اس کے مقام سے اُسے اونچا نہ جاؤ کہ قوموں کی ہلاکت و بربادی اسی غلو سے ہوئی ہے۔

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین

دین میں غلو مت کرو کہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔

پھر فرمایا کہ یاد رکھو قوموں کی تعمیر و تربیت میں آغوشِ امومت کا حصہ بڑا بنیادی ہوتا ہے۔ اسی لئے اپنے نظامِ مدنیت میں عورتوں کی صحیح پوزیشن کو نظر انداز نہ کر دینا۔

فاتقوا اللہ فی النساء۔ ان لکم علی نسائکم حقا ولھن علیکم حقا

عورتوں کے معاملے میں (بھی) قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یاد رکھو تمہارے عورتوں پر اور عورتوں کے تم پر حقوق ہیں۔ (ان حقوق کو نظر انداز مت کرو۔)

یہ فرما کر آپؐ نے مجمع پر ایک غائر نظر ڈالی۔ قریب ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم اس شمعِ نبوت کے گرد تھا۔ وہ گروہِ عظیم جس کی گردنیں دنیا کی کسی طاغوتی قوت کے سامنے نہیں جھک سکتی تھیں اپنے خدا کے حضور سر جھکائے کھڑا تھا ــــ اس سعادتِ عظمیٰ کی فراوانی

پرشاداں و نازاں جو انھیں مجاہدانہ سعی و عمل کے سلسلہ میں بارگاہِ رب العزت سے اس طرح عطا ہوئی تھی اور ان ذمہ داریوں کے بارگراں کے احساس سے لرزاں و ترساں جو نوع انسانی کی امامت و قیادت کے سلسلہ میں ان پر عائد ہو رہی تھیں۔ حضورؐ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا۔

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون

تم سے خدا کے ہاں پوچھا جائے گا۔ کہو تم کیا جواب دو گے؟

لاکھوں زبانیں ایک ہی وقت پکار اٹھیں کہ ہم کہیں گے کہ آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ اور اپنا فرض ادا کر دیا۔

کتنی عظیم الشان ہے یہ شہادت جو کسی انسان کو اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد میسر آجائے۔ آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا۔

اللّٰھم اشھد اے خدا! تو گواہ رہنا

جس شاہد عادل کی گواہی کی استدعا کی گئی تھی اس نے اپنی شہادت کو کل پر اٹھائے رکھنے کے بجائے اسی وقت اعلان کر دیا کہ

تکمیلِ دین کا اعلان

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ اور (اسی طرح) اپنی نعمت کا اتمام کر دیا۔ اور تمہارے لئے اسلام کا دین انتخاب کر لیا

ہزاروں آنکھیں تھیں جو تمام نعمت کی اس بشارتِ عظمیٰ پر فرطِ مسرت سے عطر پاش تھیں۔ لیکن سینکڑوں آنکھیں ایسی بھی تھیں جو اپنے محبوب کی جدائی کے احساس سے شبنم نشاں تھیں اس لئے کہ انھوں نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ تکمیلِ دین کے بعد اس ذاتِ گرامی کی دنیا میں ضرورت نہیں رہے گی۔ اور یہ آیۂ مقدسہ اس آنیوالی ساعتِ فراق کی پیش آہنگ ہے۔

خطبہ سے فارغ ہو کر حضورؐ جانبِ منیٰ روانہ ہوئے۔ اس شاہانہ جلوس کا انداز یہ تھا کہ ایک حبشی غلام (حضرت بلالؓ) ناقہ کی مہار پکڑے تھے اور ایک غلام ابن غلام (حضرت اسامہ بن زیدؓ) شریکِ سواری، کپڑا تان کر فرقِ مبارک پر سایہ کئے تھے۔ اور اونٹنی پر ایک پالان تھا جس کی قیمت ایک روپے سے زائد نہ تھی۔ خدا کی طرف سے تکمیلِ دین کا اعلان ہو چکا تھا۔ اور یہ دین اپنی عملی شکل میں خدا کی زمین پر نافذ۔ یعنی نظامِ انسانیت فطرت کے صحیح خطوط پر متشکل ہو چکا تھا وہ نظام جس پر چلنے کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن جس پر انسان کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کی آمیزش نے اس کی ہیئت بدل ڈالی تھی۔ آج اس کی تمام کثافتیں اور آلودگیاں یکسر دور ہو گئیں اور وہ نظام اسی حالت پر آ گیا جس پر اسے خلاقِ فطرت نے متعین کیا تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ

زمانہ اپنے مرکزِ اصلی پر

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السموٰت والارض۔

زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نقطہ پر آ گیا جس پر اللہ نے اسے تخلیق ارض و سموٰت کے وقت متعین کیا تھا۔

یہی مقصودِ فطرت تھا۔ یہی انسانی تگ و تاز کا منتہیٰ تھا۔ یہی اس کاروانِ رشد و ہدایت کی آخری منزل تھی جو کبھی جودی کی چوٹیوں پر ٹھہرا اور کبھی شام کے سبزہ زاروں میں رکا۔ کبھی نیل کی وادیوں میں گھوما اور کبھی سینا کے پہاڑوں سے گذرا۔ کبھی یروشلم کے میدانوں میں اترا اور پھر بطحا کے صحراؤں میں فروکش ہوا۔ یہی وہ جنت تھی۔ جو جنت سے نکلے ہوئے آدم کو اس کے اعمال کے بدلے میں ملنی تھی اور جو کہ پھر نہ چھننی تھی۔ بشرطیکہ وہ اس نظام پر عمل پیرا رہتا۔

اس اعلانِ عظیم کے بعد حضورؐ نے پھر مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

الا ھل بلغت

کیوں! میں نے پیغامِ خداوندی تم تک پہنچا دیا؟

سب بول اٹھے۔ ہاں پہنچا دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

اللّٰھم اشھد

اے خدا تو گواہ رہنا

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

فلیبلغ الشاھد الغائب

جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔

اور اس طرح اس پیغامِ خداوندی کی وسعتوں کو ابدیت سے ہمکنار کر دیا۔

مدینہ کو واپسی

تکمیلِ دین کے اس فریضۂ مہم سے فارغ ہو کر یہ کاروانِ سعادت در رحمت، مراجعت فرمائے مدینہ ہوا۔ نواحِ مدینہ پر نگاہ پڑی تو فرمایا۔

اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ۔ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔ آئبون۔ تائبون۔ عابدون ساجدون۔ لربنا حامدون۔ صدق اللہ وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ

کبریائی و جبروت سب خدا کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے وہ [illegible] لا شریک لہٗ حکومت صرف اسی کے لئے ہے اور ستائش و نیائش کا مرکز صرف اسی کی [illegible] پر قادر ہے۔ لوٹے آتے ہیں اس کے بندے ساری دنیا سے منہ موڑ کر صرف اسی کے آستانہ کی طرف [illegible] کئے ہوئے (تائبون)۔ تمام طاغوتی قوتوں کی سرکشیوں کو پامال کر کے صرف اسی کی محکومیت کا قلادہ

زیب گلو کئے ہوئے (عابدون)، ساری دنیا کے سامنے غیور انہ اٹھنے والی پیشانیاں اس کے سنگ آستاں پر سجدہ ریز۔ (ساجدون) تمام دنیا سے خراجِ تحسین وصول کرنے والے اس مرجع حسن وخوبی کی حمد وستائش میں زمزمہ بار اس لئے کہ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا اپنے بندے کی مدد کی۔ اور تمام مخالف قوتوں کو شکست دی۔ آپ سے ہیں خدا کے بندے لوٹ کر۔

استقبالِ خسروانہ

نظامِ انسانیت کی امامتِ کبریٰ کا یہ مرکزِ اولین تکمیلِ دین و اتمامِ نعمت کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے بکمالِ حسن و رعنائی واپس آ رہا ہے۔ اور مدینہ کی گلیوں کا ذرہ ذرہ ابھر کر کہہ رہا ہے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا | اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
اے زمیں از بارگاہت ارجمند | آسماں از بوسہ بامت بلند
اے تو بالا پایۂ ایں کائنات | فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ و چشم ہائے ما بگیر

سکانِ ارضی حمد وستائش میں اس طرح نغمہ سنج و زمزمہ بار تھے اور آسمان سے خدا اور اس کے فرشتے اس تکمیل کار و حسن آب پر یہ کہہ کر تبریک و تہنیت کے پھول برسا رہے تھے کہ

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ
وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کس قدر مبارک ہے وہ آغاز جس کا انجام اس قدر حسین ہو۔ اور کیسی پر بہار ہے وہ شاہراہِ زندگی جو اس آغاز و انجام سے بغاظ سے مربوط ہو۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ حَمْدًا كَثِيْرًا

وفات

دین کی تکمیل ہو گئی۔ انسانوں کی راہ نمائی کے لیے جس قدر اصولی قوانین کی ضرورت تھی وہ قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ ان اصولی قوانین کی عملی تشکیل سے اس قوانین پر آسمان کی بادشاہت متمکن کر دی گئی انسان کی نگہ بصیرت نے اس صراط مستقیم کو واضح طور پر دیکھ لیا جس پر گامزن ہونے سے وہ اپنے شرف و مجد کے نقطۂ آخریں تک پہنچ سکتا ہے۔ ان ارباب قلب و نظر کی ایک جماعت تیار ہو گئی جو خود اس شاہراہِ زندگی پر جادہ پیما ہوں اور دوسروں کے لئے دلیلِ راہ بنیں اور اس طرح دارث کتاب الٰہی بن کر اس نظامِ اجتماعیہ انسانیہ کو آگے چلائیں۔ رسول اپنا فریضہ ادا کر چکا تھا۔

ہر انسان کی طبعی زندگی کے لئے خاتمہ یقینی ہے۔ رسول بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی حیاتِ ارضی کے لئے بھی خاتمہ کا دن مقرر تھا۔ گذشتہ اوراق میں جہاں نبی اکرم کی بشریت کے متعلق بحث آئی ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ آپ کے متعلق واضح الفاظ میں بتا دیا

گیا کہ انک میت و انہم میتون۔ ہر پیدا ہونے والے کے لئے مرنا ہے لیکن خوش بخت ہے وہ موت جو مقصد حیات کی تکمیل کے بعد آئے۔ یہی وہ موت ہے جس پر نفس شماری کی ہزاروں زندگیاں تصدق کی جا سکتی ہیں۔ اسی موت میں حیات ابدی کا راز پوشیدہ ہے۔ کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی ناپنے کا ایک ہی مقیاس ہے اور وہ یہ کہ جس وقت وہ دنیا میں آیا اور جس وقت اس نے دنیا کو چھوڑا ان دونوں حالتوں میں اس نے کیا تغیر پیدا کیا۔ اگر اس نے دنیا کو اسی حالت میں چھوڑا ہے جس میں پایا تھا تو یہ زندگی انسانی زندگی نہیں، خواب و خور کی حیوانی زندگی ہے۔ اور اگر اس نے اس میں صحیح خطوط پر تغیر و تبدل کیا تو اس کی عظمت اسی تغیر و تبدل کے بمقدار ہے۔ پس کس قدر عظیم المرتبت ہے وہ حیات طیبہ جس نے دنیائے انسانیت میں ایسا انقلاب پیدا کیا جس کی وسعتیں دنیا کے آخری انسان کی زندگی تک کو محیط ہیں۔ یہی انقلاب مقصود فطرت تھا جس نے انسانی ممکنات کے لئے ایک نئی دنیا کا راستہ کھول دیا۔ ایسے انسان کی موت محسود صد حیات ہے۔

تکمیل دین کا اعلان ذی الحجہ ۱۰ھ میں ہوا۔ ۱۸ یا ۱۹ صفر ۱۱ھ کو نبی اکرم کا مزاج ناساز ہوا۔ قریب تیرہ روز علالت رہی۔ زمانۂ علالت میں حضورؐ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں اسی جذب و انہماک سے مصروف رہے اور دین کے ان اساسی اصولوں کو بار بار سامنے لاتے رہے جن میں تبدیلی پیدا کر دینے سے اس کی رفیع الشان عمارت اپنی بنیادوں سے ہل جاتی ہے۔ دین کا نقطۂ مسکہ اور عروۃ الوثقیٰ یہ اصل عظیم ہے کہ قانون دینے کا حق صرف ذاتِ خداوندی کو ہے کسی انسان کو نہیں اور مکافاتِ عمل کا قانونِ فطرت اٹل ہے۔ اس لئے ہر انسان کو اپنی نگاہ کی ہر جنبش اور قلب کی ہر حرکت کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اپنے آخری خطبہ میں انہی اہمات اصول کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ

> حلال اور حرام کی نسبت میری طرف نہ کرنا۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔

پھر فرمایا۔

> اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ اور اے پیغمبر خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

علالت کے تیرھویں روز یکم ربیع الاول ۱۱ھ مئی ۶۳۲ء صبح کے وقت طبیعت میں کچھ سکون تھا لیکن نقاہت زیادہ تھی۔ اس لئے آپ نے حجرۂ مبارک سے لیٹے لیٹے پردہ اٹھا کر مسجد کی طرف دیکھا تو لوگ نماز میں مشغول تھے۔ اللہ کے بندوں کو اپنے اللہ کے سامنے سجدہ ریز دیکھ کر فرطِ مسرت سے چہرہ بشاش ہو گیا۔ جھکی ہوئی نگاہوں سے درگاہ رب العزت میں شکر و امتنان کے سجدے ادا کئے۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا مرض کی شدت بڑھتی گئی۔ نقاہت سے بار بار غشی طاری ہو جاتی لیکن جب ہوش آتا تھا تو زبان مبارک پر یہ الفاظ ہوتے تھے کہ مع الذین انعم اللہ علیہم۔ ان سعادت مندوں کی معیت جنہیں اللہ نے اپنے انعامات سے نوازا؛ اور کبھی یہ کہ اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ سب سے بڑی رفاقت خدائے بزرگ و برتر کی

رفیق اعلیٰ

ہے۔ سہ پہر کے قریب تین مرتبہ فرمایا بل الرفیق الاعلیٰ۔ قلب کا سکون و اطمینان ایک ہلکے سے تبسم جاں نواز کی صورت میں چہرہ پر نکہت پاش و نور افشاں ہوا۔ مگر فطرت کو یہ معصومانہ انداز ایسا خوش آیا کہ اس نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ اور اس طرح اس پربہار زندگی کی جوئے رواں دامن صحرا سے صحن گلستاں میں داخل ہوگئی۔ اور آسمانوں سے ندائے جاں یہ کہتی ہوئی استقبال کے لئے آگے بڑھی کہ

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ○ وَادْخُلِي جَنَّتِي ○ (۸۹/۲۷-۳۰)

اے وہ روح کہ جسے کامل اطمینان نصیب ہے، اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ سو میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ میری جنت میں داخل ہو جا۔

سحرہا در گریبانِ شب اوست　　دو گیتی را فروغ از کوکب اوست
نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم　　چو مرگ آید تبسم برلب اوست

شمع نبوت کے پروانوں کے لئے محبوب کی یہ جدائی قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی۔ ان کے دلوں کی بستیوں میں ایک حشر برپا ہو گیا۔ دردِ فراق سے سینے شق ہو رہے تھے۔ دل کا خون آنکھوں میں کھنچا آ رہا تھا۔ دنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر ہو رہی تھی۔ بزم کائنات انہیں بے کیف نظر آ رہی تھی اور بہار زندگی افسردہ و پژمردہ۔ شدتِ کرب اور انتہائے درد سے صبر و سکون اور ضبط و ہوش ہر ایک سے وداع ہو رہا تھا۔ لیکن کہرام و خلفشار کے اس ہوش ربا عالم میں ایک ایسا پیکرِ ضبط و سکون بھی تھا جسے تربیت نبوی نے جبر میں اختیار اور بے قراری میں قرار کا سلیقہ اور شدتِ جذبات میں بقائے تسکین و ہوش اور انتہائے احساسات میں قائمی حواس اور از خود رفتگی کا قرینہ سکھایا تھا۔ وہ جسے غار کی یاس انگیز تنہائیوں میں لا تحزن ان اللہ معنا کی تعلیم ایمان افروز و استقامت بخش سے نا امیدیوں کے ہجوم میں امیدوں کا روشن مستقبل دیکھنے کا انداز بتایا تھا۔ وہ پیکرِ ضبط و استقامت۔ وہ یارِ غار نبوی ﷺ۔ وہ جس کے کاندھوں پر جانشینیٔ رسول ﷺ کا بار عظیم آنے والا تھا۔ غم و اندوہ کے اس تلاطم میں روشنی کے بلند مینار کی طرح اٹھا اور دو

ایک عظیم القدر اعلان

جملوں میں مجمع کے سامنے اس حقیقت کبریٰ کو بے نقاب کر گیا کہ اسلام کا نظام حق و صداقت اپنی داخلی قوتوں کے زور پر آگے چلنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ شخصیتوں کا وابستۂ دامن نہیں ہے کہ کسی ایک کی وفات سے سارے نظام کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ (حضرت ابوبکر صدیقؓ) منبر نبوی ﷺ پر تشریف لائے اور مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا۔

أيها الناس! من كان يعبد محمداً فانه قد مات ومن كان يعبد الله فانه حي لا يموت۔

لوگو! جو شخص محمد کو اپنا معبود سمجھتا تھا وہ جان لے کہ اس کا معبود یقیناً مر گیا۔ لیکن جو اللہ کی

عبودیت اختیار کئے ہوئے ہے اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے۔ اسے کبھی موت نہیں۔

اور اس کی سند میں فرمایا کہ

وما محمد الا رسول۔ قد خلت من قبلہ الرسل..... الخ

حضورؐ کی تجہیز و تکفین کا کام بہت ضروری تھا۔ لیکن اس سے بھی مقدم ایک اور کام تھا۔ دین کی یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ چکی تھی کہ ملت ایک ثانیہ کے لئے بھی بے امام نہیں رہ سکتی۔ نظام کی مرکزیت ہر وقت موجود رہنی چاہیئے۔ اس لئے انھوں نے سب سے پہلے انتخاب امام کا اہم ترین فریضہ ادا کیا۔ اس طرح اس نظام کو بلا انقطاع آگے بڑھا دیا جسے خدا نے ترتیب دیا اور اس کے رسول نے متشکل کیا تھا اور جسے اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے تھا۔ حتیٰ مطلع الفجر۔

یہ سلسلۃ الذہب کہاں تک آگے بڑھا اور پھر رکا کیوں؟ یہ حصہ اس داستان کی اگلی کڑی سے متعلق ہے جس کے لئے آپ کو کچھ وقت کے لئے زحمت کشِ انتظار ہونا پڑے گا۔

پرویز

معراجِ انسانیت

از:- پرویز

حضور صلعم کی ذات اقدس و اعظم شرف و مجد انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھی۔ اسے قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرت مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت:- بیس روپے۔

قرآن اور تاریخ

پرویز

دنیائے انسانیت میں جو اہمیت تاریخ کو حاصل ہے وہ اربابِ فکر وبصیرت سے پوشیدہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک بڑا امتیازی نشان تاریخ ہے۔ حیوانات کی حالت یہ ہے کہ وہ ہزارہا سال گذرنے کے بعد بھی اسی مقام پر ہوتے ہیں جہاں ان کی نوع کا پہلا حیوان تھا۔ (مثلاً) جو ہرن آج ہمارے سامنے آتا ہے وہ انہی صلاحیتوں اور خاصیتوں کا حامل ہوتا ہے جو دس ہزار سال پہلے کے ہرن میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن (اس کے برعکس) آج کا انسان' (صلاحیتوں اور خاصیتوں' نیز احوال وظروف کے اعتبار سے) دس ہزار سال پہلے کے انسان سے یکسر مختلف ہے۔ دس ہزار سال پہلے کا انسان آگ تک جلانا نہیں جانتا تھا۔ اسے گھر بنانا نہیں آتا تھا۔ اس کے پاس نہ کسی قسم کے اوزار اور ہتھیار تھے' نہ آلات وادوات۔ اس کی زندگی قریب قریب حیوانات کی سی زندگی تھی۔ لیکن آج کا انسان —— آج کا انسان چاند تک پہنچنے کی فکر میں ہے۔ آج ہمارے بچے اتنا کچھ جانتے ہیں جتنا آج سے سو سال پہلے کے عالم نہیں جانتے تھے۔ سو سال تو ایک طرف جو باتیں ہمارے بچپن میں طلسم ہوشربا کے افسانے اور الہ دین کا چراغ معلوم ہوا کرتی تھیں' وہ آج روزانہ کا معمول بن چکی ہیں۔ انسان کی یہ ترقی کس بنا پر ہے؟ محض اس بنا پر کہ ایک نسل یا ایک زمانہ کا انسان اپنے تجربات اور مشاہدات کو اگلی نسل تک منتقل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (اور حیوانات میں یہ صلاحیت نہیں)۔ اسی کو تاریخ کہتے ہیں۔ انسان کی تمام ترقیوں کا راز اسی میں مضمر ہے۔ زمانہ اپنے ارتقائی منازل اس کے سہارے طے کرتا آرہا ہے۔ تہذیب وتمدن کی متاعِ گراں اور علم وہنر کی شمعِ فروزاں' جب اور جہاں نظر آئے گی' تاریخ ہی کی رہینِ منت ہوگی۔

تاریخ کیا ہے؟

تاریخ کیا ہے؟ قرنہا قرن کی انسانی جدوجہد کا ماحصل۔ ہزارہا سال کی مسلسل تگ وتاز کا نچوڑ۔ اقوام وملل کی سینکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ۔ انسان کے قلب ودماغ کی کاوشوں کا سیلِ رواں جو اپنے سرچشمہ کے قریب ایک جوئے کم آب سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا حدود فراموش ہوتا گیا۔

خارجی شاہدات وتجربات سے ہٹ کر، انسانی معاشرہ کی طرف آئیے تو' اقبال کے الفاظ میں' ایک قوم کے لئے تاریخ کی حیثیت وہی ہے جو ایک فرد کے لئے حافظہ کی ہے۔ اگر کسی فرد کا حافظہ گم ہوجائے تو اس کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اگر

کسی قوم کی تاریخ صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے تو خود اُس قوم کا وجود بہ حیثیت قوم ختم ہو جاتا ہے۔ قومیں اپنے ماضی کے پشتارے کو اپنی کمر پر لادے لادے آگے بڑھتی ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اپنے تاریخی سرمایہ، یعنی ماضی سے مسلسل چلے آنے والے، اور بڑھتے پھیلنے والے اندوختہ سے جو اس قدر فیضیاب ہوتا ہے تو کس طرح ہوتا ہے؟ اس کا راز کیا ہے؟ اس کا راز یہ ہے کہ کائنات میں خدا کے غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں، اس لئے جس بات کا جو نتیجہ آج سے ہزار سال پہلے برآمد ہوا تھا، وہی بات اگر آج دہرائی جائے گی تو اس کا وہی نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔ آج سے (مثلاً) پانچ ہزار سال پہلے کے انسان نے دیکھا کہ جو شخص سنکھیا کھا لیتا ہے، مر جاتا ہے۔ اس نے اس تجربہ (یا مشاہدہ) کو آگے منتقل کر دیا۔ لہٰذا ہم حتم و یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر آج بھی کوئی شخص سنکھیا کھائے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔

تاریخ کی افادیت کا راز

پھر جو کیفیت طبعی قوانین (Physical Laws) کی ہے، وہی ان قوانین کی ہے جن کا تعلق انسان کی حیات اجتماعیہ سے ہے۔ جن قوانین کی خلاف ورزی سے آج سے دو ہزار سال پہلے کی قومیں تباہ و برباد ہوتی تھیں، ان سے روگردانی کا نتیجہ آج بھی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ جن قوانین کی اتباع سے اُس زمانے میں زندگی اور توانائی ملتی تھی، ان سے تمسک بپنے کا نتیجہ آج بھی سربلندی و سرفرازی ہوگا۔

یہ کلیہ کہ جو عمل ایک دفعہ ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس سے ہر بار ویسا ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے، سائنس کہلاتا ہے۔ آج ہم تاریخ کی سائنس (Science of History) یا تاریخ بہ حیثیت سائنس کے الفاظ عام طور پر سنتے ہیں، لیکن دنیا میں سب سے پہلے جس نے تاریخ کو اس حیثیت سے پیش کیا، وہ قرآن تھا۔ قرآن سے پہلے اول تو تاریخ مرتب کرنے کا عام رواج ہی نہ تھا۔ مورخین اِکا دُکا کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن کے نزدیک بھی تاریخ سے مقصود وقائع نگاری (یعنی واقعات و حوادثات کو اکٹھا کر دینے) سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ تاریخ کو بحیثیت ایک سائنس کے پہلی مرتبہ قرآن نے پیش کیا ہے اور یہ کچھ تاریخ ہی پر کیا منحصر ہے، قرآن نے اپنے ہر دعوے کو سائنس کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ کالرج نے کہا ہے کہ شاعری (Poetry) کی مد مقابل (Anti-Thesis) نثر (PROSE) نہیں، سائنس ہے۔ قرآن نے جب اپنے متعلق کہا ہے کہ میرے ہاں شاعری نہیں تو اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ کتاب نثر میں لکھی گئی ہے۔ شعر میں نہیں لکھی گئی۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کا ہر دعویٰ سائنس کے اصولوں پر پورا اترے گا۔ یونہی شاعرانہ ادعا ثابت نہیں ہوگا۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن، تاریخ کے مطالعہ پر اس قدر زور دیتا ہے۔

سائنس آف ہسٹری

اس قدر زور دیتا ہے کہ اس نے کہا کہ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ہم نے تمہاری طرف اپنے واضح قوانین نازل کئے اور ان قوانین کے ساتھ وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ اقوام سابقہ کے حالات نازل کئے وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (24/34) یعنی ان لوگوں کے لئے جو

قرآن اور تاریخ کا مطالعہ

زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچا چلتے ہیں، سامانِ عبرت و موعظت یعنی قرآن کے غیر متبدل قوانین جنہیں نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت بننا ہے، اور ان کے ساتھ تاریخی امثال و نظائر، دونوں منزل من اللہ ہیں۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا کہ قرآن کی رُو سے اقوامِ سابقہ کی تاریخ کی اہمیت کیا ہے؟ قرآن میں امم گذشتہ کے احوال و ظروف کا تذکرہ جو اس شدت و تکرار سے آیا ہے تو اس سے مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اُس ضابطۂ ہدایت کی زندہ شہادات ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور جن کی خلاف ورزی سے قومیں ہلاکت اور تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہیں۔

سبعاً من المثانی

اسی حقیقت کو قرآن نے سورۂ حجر میں ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ نے یہ الفاظ اکثر و بیشتر سنے ہوں گے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ (History Repeats Itself) اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخ کے واقعات اُسی شکل و صورت میں بار بار سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ بار بار اس حقیقت کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ فلاں اندازِ زندگی کا نتیجہ فلاں قسم کا ہوگا اور فلاں روش کے عواقب فلاں نوعیت کے۔ تاریخ کے اپنے آپ کو اس طرح دہرانے کا تصور بھی پہلے پہل قرآن نے پیش کیا۔ سورۂ حجر میں اقوامِ سابقہ کا تذکرہ اسی زاویۂ نگاہ سے پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵/۸۷) مثانی کے معنی ہیں وہ چیز جو بار بار دہرائی جائے۔ یعنی تاریخی شواہد۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے تجھے ایک تو زندگی کے وہ بنیادی اصول دیئے جن کے مطابق اعمالِ حیات اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں اور دوسرے وہ متعدد تاریخی واقعات جو اس امر کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ ان قوانین سے فی الواقعہ اسی قسم کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

یہ تاریخی نظائر اس لئے دیئے ہیں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ فلاں قوم نے اس قسم کی روش اختیار کی تو اس کا انجام کیا ہوا۔ سورۂ مومن میں ہے۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کیا یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں چلے پھرے نہیں کہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گزری ہیں ان کا انجام کیا ہوا تھا؟ اس میں یہ نکتہ

سیروا فی الارض

بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کے نزدیک تاریخ کا مطالعہ، لائبریریوں کے اندر کتابیں پڑھنے ہی سے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ کا طالب العلم ان قوموں کے دیار و امصار میں جائے اور اُن کے اجڑے ہوئے کاشانوں کے کھنڈرات سے ان کے عروج و زوال کی داستانیں مرتب کرے۔

بہرحال، مندرجہ بالا آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ اگر کوئی قوم کسی طرح دولت اور قوت جمع کرلے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہو، تو اسے زوال نہیں آسکتا۔ وہ انہی مادی ذرائع کے بل بوتے پر زندہ و پائندہ اور صاحبِ غلبہ و اقتدار رہ سکتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے قوموں کی زندگی اور استحکام کے لئے صرف مادی اسباب و علل کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس قوم کو اُن اصولوں کا حامل بھی ہونا چاہیئے جن کے مطابق معاشرہ قائم کرنے سے استحکام اور بقا حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جن اقوامِ سابقہ کی طرف قرآن نے مذکورہ صدر آیت میں اشارہ کیا ہے ان کے

متعلق کہا کہ وہ تعداد کے لحاظ سے بھی (اس قوم مخاطب سے) زیادہ تھے۔ اور طاقت اور زمینی آثارات میں بھی ان سے بڑھ کر۔ لیکن اسکے باوجود فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ان کا کسب و ہنر جس پر انہیں اس قدر ناز تھا ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن عواقب سے انہیں بالکل نہ بچا سکا۔ وہ ان کے کسی کام بھی نہ آیا فَلَمَّا جَآءَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ ان کے پاس فرستادگانِ خداوندی صحیح اور واضح ضابطۂ حیات لے کر آتے لیکن وہ اپنے خود ساختہ آئین وضوابط ہی پر نازاں رہتے اور جس روشِ زندگی کی طرف وہ رسول دعوت دیتے تھے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حَاقَ بِھِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَھْزِءُوْنَ۔ ان کی غلط روش خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق (جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے) تباہ کن نتائج مرتب کرتی رہی۔ لیکن یہ کچھ غیر محسوس طور پر ہو رہا تھا۔ اور اسی لئے وہ باوجود سخت تنبیہ اور تاکید کے اپنی غلط روش سے باز نہیں آتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جو ان سے کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کے نتائج تمہیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں تو یہ محض ڈراوا ہی ڈراوا ہے۔ لیکن اس کے بعد (جب یہ عبوری وقفہ ختم ہوا اور) ان کے غلط معاشرہ کے تباہ کن نتائج محسوس شکل میں ان کے سامنے آگئے۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ۔ تو اس وقت وہ پکار اٹھے کہ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ خدا کے قوانین واقعی سچے ہیں۔

تباہی کا احساس

اس مقام پر فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا کہا ہے۔ یعنی انہوں نے جب ہمارے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دوسری جگہ کہا ہے فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (۲۱/۱۲)۔ جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھ لیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ عذاب اس سے بہت پہلے سے مشکل ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن پہلے وہ غیر محسوس اور غیر مرئی منازل میں تھا۔ اس کے بعد وہ محسوس و مرئی شکل میں سامنے آگیا۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ وقفہ درحقیقت اس عبوری دور کا نام ہے جس میں اعمال کے تباہ کن نتائج وجود کوشش ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہنوز محسوس ہو کر سامنے نہیں آتے۔ اسی کو ہم اصطلاح میں مہلت کا وقفہ کہتے ہیں۔ یعنی اس وقفہ میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ اگر وہ قوم اپنی روش درست کرے تو اس کی صحیح روش کے زندگی بخش نتائج سابقہ روش کے تباہ کن عواقب کے اثر کو زائل کر دیں۔ لیکن جب ہلاکت محسوس شکل میں سامنے آجائے تو اس وقت اس حقیقت کا اقرار کہ خدا کے قوانین سچے تھے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُھُمْ اِيْمَانُھُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا۔ جب ٹیکیا ان کے جسم کی وریدیں اور شریانیں پھاڑ دے۔ اور زندگی کے خلیات (Life Cells) کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دے تو اس وقت اس امر کا اعتراف کہ ڈاکٹر کا کہنا ٹھیک تھا کہ سنکھیا تمہیں مار دے گا، زندگی واپس نہیں لا سکتا۔

سنۃ اللہ

یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ۔ یہ بات یونہی اتفاقی طور پر (By Chance) نہیں ہو گئی۔ یہ ہمارا قانون ہے جو اقوامِ عالم میں اسی طرح چلا آرہا ہے۔ اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ وَخَسِرَ ھُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰/۸۵)۔ جس قوم نے بھی اس کی صداقت سے انکار کیا وہ تباہ

و برباد ہوگئی۔

غور کیجئے۔ قرآن نے اسے سنت اللہ کہا ہے۔ یعنی خدا کا قانون۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے تاریخ کا مطالعہ درحقیقت سنت اللہ کا مطالعہ ہے جو شروع سے آخر تک ایک ہی نہج سے چلی جائے گی۔ اس میں کبھی اور کہیں تبدیلی نہیں ہوگی سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲) خدا کا یہی قانون تھا جو ان لوگوں میں جاری و ساری تھا جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں (اور یہی قانون اب ان لوگوں میں جاری ہوگا) اس لئے کہ قانون خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ دوسری جگہ ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵/۴۳)۔ اس قانون خداوندی کے نتائج و عواقب میں تبدیلی تو ایک طرف تم اس کے رخ اور سمت میں بھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ خدا کا قانون آندھی کا جھکڑ یا دریا کا سیلاب نہیں کہ جدھر جی میں آیا رخ کر لیا۔ یہ ٹھیک اسی سمت میں جائے گا جس طرف اسے جانا چاہیئے۔

یہ سنت اللہ یا قانونِ خداوندی کیا ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی یا استثناء نہیں ہوتی؟ اس کے متعلق قرآن نے مختلف مقامات میں بڑی شرح و بسط سے تفاصیل دی ہیں۔ لیکن ان تفاصیل کا ملخص یہ ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ

کشمکش حق و باطل

کائنات میں حق اور باطل کی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ حق کے معنی ہیں خدا کے وہ محکم اصولِ زندگی جن کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے اور جو کائنات اور انسان کی نشوونما کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں باطل کے معنی ہیں وہ تمام غیر خداوندی قوانین و ضوابط جو کائناتی اور انسانی نشوونما کے راستے میں حائل ہوتے ہیں اور جن کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہوتا ہے۔ لہٰذا کائنات میں ایک کشمکش پیہم جاری ہے جس میں حق اور باطل برسرپیکار رہتے ہیں۔

پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ کہ کبھی اتفاق سے حق غالب آگیا۔ اور کبھی باطل کامیاب ہوگیا؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ فَيَدْمَغُهٗ۔ حق باطل کا سر توڑ کر رکھ دیتا ہے فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) سو دیکھو کہ وہ کس طرح نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ خدا نے کائنات کا یہ سلسلۂ عظیم یونہی کھیل اور مذاق کے طور پر پیدا نہیں کر دیا کہ اس میں کبھی کچھ ہو جائے کبھی کچھ۔ (۲۱/۱۶) کائنات کا ذرہ ذرہ اس مقصدِ جلیل کے لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہوتا ہے وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۵۳/۳۱) کائنات کی پستیوں میں بلندیوں میں ہر شے اللہ کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروف عمل ہے۔ تاکہ ناہمواریاں پیدا کرنے والے کاموں کا نتیجہ انہی کے مطابق مرتب ہو اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے کا نتیجہ حسین و خوشگوار ہو۔

قانون مکافات

دوسرے مقام پر ہے اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ (۱۰/۴) اس نے کائنات کے سلسلۂ تخلیق کی ابتدا کی ہے۔ اور پھر اسے وہ گردشیں دیتا رہتا ہے تاکہ وہ لوگ جو اس کے قانون کو سچا مان کر صلاحیت بخش کام کریں، انھیں حق و انصاف سے پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ اسی طرح سورۂ سبا میں ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کا ایک ایک ذرہ خدا کے سامنے ہے اور اس کے قانون کے مطابق مصروف

تگ و تاز ہے لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۳۴) تاکہ وہ ایمانِ صالح کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دیتا ہے۔ لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ کوئی قوم غلط روشِ زندگی اختیار کرے اور اس کا نتیجہ زندگی کی مرفہ الحالیاں اور سرفرازیاں ہوں۔ اور کوئی قوم صحیح ضابطۂ حیات پر عمل پیرا ہو اور وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

ہیگل اور مارکس کے نظریات

ہمارے زمانہ میں تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے (مشہور فلاسفر) ہیگل نے پیش کیا اور اسی نظریہ پر بعد میں مارکس نے اپنے معاشی نظام کی عمارت اٹھائی۔ لیکن ہیگل کے تصور اور قرآن کے پیش کردہ اصول میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ ہیگل کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں ایک تصور (Idea) پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کی فضا میں بڑھتا، پھولتا اور پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ عین شباب تک پہنچ جاتا ہے تو اسی کے اندر سے ایک اور تصور ابھرتا ہے جو اُس (پہلے تصور) کی ضد ہوتا ہے۔ یہ نیا تصور اُس سابقہ تصور کو مٹا کر اس کی جگہ آپ لے لیتا ہے پھر یہ تصور اُسی طرح بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا اور جوان ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس میں سے اس کی ضد دوسرا تصور ابھرتا ہے۔ تصورات کی یہ کشمکش شروع سے مسلسل چلی آ رہی ہے اور اسی طرح چلی جائے گی۔ تاریخ اسی کشمکش پیہم کی داستان ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ہیگل کے نظریہ کی رُو سے، دنیا میں ثبات اور دوام کسی تصور کو نہیں۔ ہر تصور کچھ مدت کے لئے جلوہ نما ہوتا ہے اور پھر مرجھا کر گر پڑتا ہے، اور اس کی جگہ اس سے متضاد تصور لے لیتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ (ہیگل کے نزدیک) کوئی تصور نہ اپنی ذات میں خیر ہے نہ شر، نہ حق ہے نہ باطل۔ اس کے برعکس قرآن نے جو اصول پیش کیا ہے اس کی رُو سے ایک تصور اپنی ذات میں حق اور صداقت کا جوہر پنہاں رکھتا ہے۔ اور اسی میں اس کے ثبات و دوام کا راز مضمر ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا تصور اپنی تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ رکھتا ہے اور جب بھی حق کے مقابلہ میں آتا ہے۔ خاسر و نامراد ہو کر فرار ہو جاتا ہے۔ تاریخ حق و باطل کی اسی کشمکش کی داستان ہے۔

مارکس نے ہیگل ہی سے تاریخ کا نظریہ لیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس نے کہا ہے کہ دنیا میں ایک نظام پیدا ہوتا ہے (ہیگل نے تصور کہا تھا مارکس نے اس کی جگہ نظام کہا) کچھ عرصہ تک وہ نظام چلتا ہے۔ جب وہ شباب تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام ابھرتا ہے۔ جو پہلے نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ خود مسلط ہو جاتا ہے۔ جب یہ نظام انتہائی عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی ضد دوسرا نظام پیدا ہوتا ہے جو اس کی جگہ متمکن ہو جاتا ہے۔ تاریخ انہی مختلف نظاموں کی آمد و شد کی کہانی ہے۔

قرآن کی رُو سے یہ نظریہ بھی غلط ہے اس کا پیش کردہ اصول یہ ہے کہ جو نظام حق کی بنیادوں پر متشکل ہوگا اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوگی۔ جو باطل کے خطوط پر قائم ہوگا وہ حق کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے۔

تاریخی وجوب

جب ہیگل یا مارکس سے پوچھا گیا کہ ایک تصور کی جگہ دوسرا تصور اور ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام کس قوت کے

بل پڑتا اور حچھا جاتا ہے تو ان کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایسا تاریخی وجوب (Historical Necessity) سے ہوتا ہے۔ اسی کو زمانے کا تقاضا کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب ایک اصطلاح کی آڑ میں پناہ لینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (۳۹/۱۲) یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے یا تمہارے اسلاف نے رکھ لئے ہیں۔ ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ اس کے برعکس قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ کارگہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس مقصد عظیم کے لئے سرگرم سعی و عمل ہے کہ تعمیری قوتیں کامیاب و نتیجہ خیز ہوں اور تخریبی قوتیں آخر الامر مغلوب و منکوب ہیں۔ یعنی مقصد تخلیق کائنات حق کا غلبہ اور باطل کی شکست ہے۔ اس لئے ایسا ہو کر رہنا ناگزیر و لاینفک ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کے پیش کردہ تاریخی تصور اور ہیگل اور مارکس کے تاریخی نظریہ میں کس قدر بنیادی فرق ہے۔

ثبات و دوام کس کے لئے ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا تصور یا نظام ہے جس کے لئے ثبات و دوام ہے۔ اور جسے حق پر مبنی نظام کہا جائے گا۔ اس کی تفصیل طول طویل ہے لیکن قرآن نے اس تفصیل کو ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں یوں سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ سورۂ رعد میں ہے کہ آؤ ہمیں ایک دو مثالوں کے ذریعے بات سمجھائیں اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً آسمان سے بارش برستی ہے فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا۔ تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا۔ اور اس طرح سیلاب اس جھاگ (اور خس و خاشاک) کو بہا کر لے جاتا ہے جو پانی کے اوپر آجاتی ہے۔ یعنی پانی جو لوگوں کے لئے باعث منفعت ہوتا ہے باقی رہتا ہے اور خس و خاشاک اور کوڑا کرکٹ سب بہہ جاتا ہے۔

یا مثلاً وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ۔ جب سونا یا کوئی دھات آگ میں پگھلاتے ہیں تاکہ اس سے زیور یا دیگر اشیائے مستعملہ بنائی جائیں تو وہاں بھی یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے اور ملاوٹ جھاگ کی شکل میں اوپر آجاتی ہے جسے باہر پھینک دیا جاتا ہے كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ ان کی کشمکش میں بھی یہی ہوتا ہے کہ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً۔ جھاگ اور میل کچیل جنس ناکارہ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہے۔ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ اور ہر وہ شے جو نوع انسانی کے لئے منفعت

ما ینفع الناس

بخش ہوتی ہے زمین میں باقی رہ جاتی ہے كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳/۱۷) اس طرح اللہ مثالوں سے تبیان حقیقت کرتا ہے۔

یعنی کائنات میں ثبات و دوام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ ہر وہ نظریہ ہر وہ تصور۔ ہر وہ نظام جو کسی خاص گروہ۔ خاص ملک یا خاص قوم نہیں۔ بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہو

اسے بقا اور استحکام ہوگا جو اس کے خلاف جائے گا وہ فنا ہو جائے گا۔ بالفاظ دیگر حق کی عملی پہچان یہ ہے کہ وہ نوع انسانی کے لئے منفعت بخش (تعمیری نتائج کا حامل) ہوتا ہے اور باطل ضرر رساں (یا تخریبی نتائج کا حامل)۔ یہی ہے وہ بنیادی معیار جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ ہوتا ہے۔ تاریخ اسی کی زندہ شہادت کا نام ہے۔

لیکن قرآن محض میکانکی طور پر ایک نظام ہی نہیں دیتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ نظام قائم کیسے ہوگا۔ اس کے لئے وہ ایک ایسا بلند اور عمیق اصول سامنے لاتا ہے کہ جوں جوں نگاہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اصل شے

داخلی انقلاب

یہ نہیں کہ تم نے یونہی خارجی اسباب کچھ اس قسم کے پیدا کر دیئے جن کا نتیجہ نفع رساں ہو گیا۔ اصل چیز یہ ہے کہ کیا تمہاری داخلی دنیا۔ تمہاری نفسیاتی کیفیت میں بھی اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا فطری مظاہرہ خارجی نظام کی شکل میں ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کہتا ہے کہ اصل اور حقیقی انقلاب وہ ہے جو انسان کی داخلی دنیا میں پیدا ہو۔ جو خارجی انقلاب انسان کی داخلی تبدیلی کا مظہر نہیں اسے انقلاب کہہ ہی نہیں سکتے۔ باہر کی دنیا کی تمام تبدیلیاں منحصر ہوتی ہیں انسان کی داخلی دنیا کی تبدیلیوں پر۔ اس باب میں خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)؛ (۸/۵۳)

خدا کا قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر (نفسیاتی) تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

ایمان کے معنی

یہ داخلی دنیا کی تبدیلی۔ یہ انقلاب اندر شعور ہے جسے قرآن "ایمان" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے (مثلاً) ایک قوم مسلسل محنت اور پیہم مشقت سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ ان قوتوں کو اپنی قومی خوش حالی اور سربلندی کے لئے صرف کرے، انہیں نوع انسانی کی منفعت کے لئے کیوں عام کر دے! قرآن کہتا ہے کہ یہ چیز صرف "ایمان" (انقلاب اندر شعور) سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی ان حقائق کو تسلیم کرنے سے کہ

(۱) انسان صرف جسم کا نام ہی نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) جسم کی پرورش ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان خود اپنے لئے استعمال کرے۔ لیکن انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش اور نشوونما کے لئے دیدے۔

(۳) انسانی زندگی کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

جب کوئی قوم ان حقائق پر ایمان لے آئے گی تو اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا وہ انتہائی کوشش کرے گی کہ دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ اسباب و ذرائع بہم پہنچائے۔ اس سے وہ نظام قائم ہوگا جو نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ وہ اس نظام کے قیام و استحکام میں "دوسروں کی منفعت" سے کہیں زیادہ خود اپنی ذات کی منفعت پنہاں دیکھے گی۔ یہ ہے وہ داخلی انقلاب جس کا لازمی نتیجہ خارجی انقلاب ہوگا۔ لیکن اگر کسی وقت اس قوم کا یہ ایمان نہ رہے تو پھر یہ نظام قائم نہیں رہ سکے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پہلے سے قائم شدہ

نظام محض اپنے زور (Momentum) یا عادت (Force of Habit) سے کچھ وقت کے لئے چلتا ہے۔ لیکن تھوڑی دور جا کر یہ رک جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم محض اپنے سیاسی مصالح یا اسی قسم کے اور محرکات کی بنا پر بعض منفعت بخش سامان زندگی میں دوسروں کو بھی شریک کرے۔ لیکن اسے آپ نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش نظام نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کے نظام کا قیام بغیر اندرونی انقلاب کے ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام صلاحیت بخش اعمال (اعمالِ صالحہ) کے لئے "ایمان" کو لازمی شرط قرار دیا ہے۔

قرآن پورے حتم و یقین سے کہتا ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی قوم اس قسم کے صلاحیت بخش متوازن نظام کی حامل ہو اور وہ تباہ و برباد ہو جائے۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱/۱۱۷) یاد رکھو! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ تیرا نشوونما دینے والا آبادیوں کو ناحق ہلاک کر دے درآنحالیکہ اس کے بسنے والے مصلحین ہوں۔ ہلاکت تو ہوتی ہی اس وقت ہے جب وہ قوم صحیح راستہ کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کر لیتی ہے۔

ہلاکت کس کے لئے ہے؟

فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶/۳۵)

تو کیا غلط روش اختیار کرنے والوں کے علاوہ کوئی اور قوم بھی ہلاک کی جا سکتی ہے؟

ہرگز نہیں! اس لئے کہ کائنات میں اندھی قوتیں کام نہیں کر رہیں کہ جسے جی چاہا پتی کے گڑھے میں دھکیل دیا جسے چاہا آسمان پر چڑھا دیا۔ یہاں ہر بات قانون اور قاعدہ کے مطابق ہوتی ہے۔ یہاں موت اور حیات کے فیصلے دلیل و برہان کی رُو سے کئے جاتے ہیں لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) کہ جسے تباہ ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے۔ خدا (معاذ اللہ) "بھیروں ماتا" یا "کالی دیوی" نہیں جو انسان کے خونِ ناحق سے خوش ہوتی ہے۔ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ قوموں پر تباہی ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔

موت اور حیات علیٰ بینۃ

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۳۰/۹)

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ خدا ان پر ظلم کرتا۔ لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ جو قوم ظلم و ستم اور جور و استبداد کی روش اختیار کرتی ہے، بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ دوسروں پر زیادتی کرتی ہے اور اپنے مفاد کا تحفظ۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ دوسروں سے لوٹ کھسوٹ کر سب کچھ اپنے لئے جمع کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کا یہ ظلم اور زیادتی دوسروں کے خلاف نہیں ہوتا۔ خود ان کی اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ غلط اعمال ہیں جن کا فطری نتیجہ اس قوم کی تباہی و بربادی ہے۔ وہ قوم دوسروں پر زیادتی کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا لیکن قانونِ مکافاتِ عمل ان کے ان جرائم کا تباہ کن نتیجہ مرتب کئے چلا جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ قوم ایک دن ہلاکت کے جہنم

ظلم خود اپنے خلاف ہوتا ہے

میں جا گرتی ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ تباہ ہونے والی قومیں خود اپنے آپ پر ظلم اور زیادتی کرتی ہیں۔ خدا نے کسی پر ظلم کر کے کیا کرنا ہے؟

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا۔ (۴/۱۴۷)

اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کی قدرشناسی کرو تو اس نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ وہ تو انسانوں کے اچھے کاموں کا قدرشناس اور ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

یعنی یہاں سوال، خدا کے ناراض ہو جانے یا اس کے خوش ہو جانے کا نہیں ہوتا۔ اس کے قانون اور اس کے فطری اور حتمی نتیجہ کا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی قوم خدا کی چہیتی اولاد ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرتی پھرے، حکومت و سطوت اور دولت و ثروت کی مالک رہی رہے گی۔ اور نہ ہی کسی قوم سے یونہی، خدا واسطے کا بیر ہے کہ وہ جتنے اچھے کام جی چاہے کرے اُسے ذلیل اور خوار ہی رکھا جائے گا۔ خدا کے ہاں تو (قانونِ مکافات کی) میزان گڑی ہے جس میں ہر فرد اور ہر قوم کے اعمال کا ایک ایک ذرہ تُلتا ہے

وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۹۹/۷-۸)

مکافات کی میزان

نہ کسی سے رعایت ہوتی ہے، نہ کسی سے بے انصافی۔ ہر عمل اپنا نتیجہ (بلا کم و کاست) مرتب کرتا رہتا ہے۔ جب تک کسی قوم کے ایسے اعمالِ حیات جو قوانینِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہوں زیادہ ہوں (یعنی ان کا پلڑا جھکا رہے) وہ قوم زندگی کی خوشگواریوں اور سربلندیوں سے فیضیاب رہتی ہے۔ (فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ۔ (۱۰۱/۶-۷) اور جس کا یہ پلڑا ہلکا ہو جائے وہ تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ (وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (۱۰۱/۸-۹))

قرآن نے اس مقام پر قوموں کی موت اور حیات کے متعلق ایک عظیم اصول بیان کیا ہے۔ دنیا میں اچھی سے اچھی قوم سے بھی بعض اوقات غلطیاں اور لغزشیں ہو جاتی ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جونہی کسی قوم سے کوئی لغزش ہوئی وہ تباہی کے جہنم میں جا گری۔ اُس قوم کے خوشگوار نتائج پیدا کرنے والے اعمال (حسنات) اس قسم کی لغزشوں کی تلافی کر دیتے ہیں جیسے تندرست و توانا آدمی سے اگر کوئی چھوٹی موٹی بدپرہیزی ہو جائے تو اس سے اس کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وہ اصول ہے جس کے مطابق قرآن نے کہا ہے کہ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴) لیکن جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کی حسنات کا پلڑا برابر اوپر کو اٹھتا جائے اور سیئات کا پلڑا جھکتا جائے تو اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم کی ہلاکت فوراً نہیں واقع ہو جاتی۔ اس کی غلط روش غیر محسوس طور پر اپنے ہلاکت آفریں نتائج مرتب کرتی

چلی جاتی اور اسے بتدریج فنا کے گھاٹ کی طرف لئے جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيثِ۔ جو اس حقیقت ثابتہ کو جھٹلاتا ہے (اے رسول) تو اسے میرے حوالے کر دے۔ میرا قانونِ مکافات ایسے لوگوں سے خود نپٹ لے گا۔ سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (۶۸/۴۴) ہم انہیں بتدریج ایسے مقام تک لے جائیں گے جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔

بتدریج ہلاکت کی طرف

اگر وہ قوم ہلاکت کی آخری منزل تک پہنچنے سے پہلے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لیتی ہے (جسے قرآن کی اصطلاح میں تَابَ وَأَصْلَحَ کہتے ہیں) تو وہ ہلاکت سے بچ جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی اور اپنی غلط روش پر بدستور آگے بڑھتی چلی جاتی ہے تو وہ آخر الامر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہلاک کہ پھر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی۔

وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (۲۱/۹۵)

اور اس قوم کے لئے جسے ہم نے (ان کے جرائم کی پاداش میں) ہلاک کر دیا۔ یہ حتمی فیصلہ ہے کہ وہ دوبارہ لوٹ نہیں سکے گی۔

چونکہ اس قوم کی یہ تباہی اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے اس دردناک انجام پر کائنات کی آنکھ میں آنسو تک نہیں آتا۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ (۴۴/۲۹)

(ان کے اس انجام پر) نہ آسمان رویا نہ زمین۔ اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔

اجل معینہ

یہ مدت جس میں کوئی قوم بامِ عروج پر پہنچتی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ تنزل میں گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس قوم کی اجل (میعاد) کہلاتی ہے۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ (۱۰/۴۹) ہر قوم کی ایک میعاد ہوتی ہے۔ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (۱۰/۴۹) اور جب ان کی یہ میعاد ختم ہو جاتی ہے (اجل آ جاتی ہے) تو پھر اس میں نہ ایک گھڑی بھر کی تاخیر ہو سکتی ہے نہ تقدیم۔ یعنی جب خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس قوم کی ہلاکت کا وقت آ جاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس میں ذرا بھی دیر سویر نہیں کر سکتی۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر قوم کی مدتِ حیات پہلے سے متعین ہوتی ہے۔ یعنی ہر قوم کی تقدیر میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے کہ اس نے اتنے سو سال تک حکومت کرنی ہے اور اس کے بعد ختم ہو جانا ہے۔ یہ تصور غلط ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قوموں کی موت و حیات کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔ لہٰذا کسی قوم کی زندگی اور عروج کی مدت بھی اسی قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ یعنی جب تک وہ قوم خدا کے حیات بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتی ہے زندہ اور توانا رہتی ہے۔ جب اس پروگرام کو چھوڑ دیتی ہے تباہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے جہاں یہ کہا ہے کہ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ (ہر قوم کی ایک مدت ہوا کرتی ہے) وہاں اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) ہر مدت کیلئے ایک قانون مقرر ہے۔

ہلاکت کے معنی

گذشتہ صفحات میں قوموں کے لئے ہلاکت کا لفظ کئی بار استعمال ہوا ہے۔ ہلاکت کے معنی یہ نہیں کہ وہ قوم طبعی طور پر (Physically) صفحۂ وجود سے مٹ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص خطہ میں بسنے والی قوم طبعی طور پر ختم ہو جائے۔ لیکن ہلاکتِ اُمم کے معنی اس سے کہیں وسیع ہیں۔ قرآن کی رو سے قوموں کی ہلاکت کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم حکومت و سطوت اور عزت و اقبال کی بلندیوں سے گر کر نکبت و زوال اور محکومی اور محتاجی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ اس قوم کے افراد جیتے ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کی حیاتِ اجتماعیہ (ملی زندگی) مٹ چکی ہوتی ہے۔ خواہ تعداد کے لحاظ سے وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ اسے اُس قوم کی ہلاکت کہتے ہیں۔ جب کوئی قوم اس طرح ہلاک ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ (مسندِ حکومت و سطوت پر) کوئی دوسری قوم متمکن ہو گئی ہے۔ اسے قوموں کا استخلاف (ایک کے بعد دوسری قوم کا آجانا) یا استبدال (ایک کی جگہ دوسری قوم کا بدل جانا) کہتے ہیں۔ قرآن نے

استخلاف و استبدالِ قومی

استبدالِ قومی کا ذکر اسی حقیقت کی تبیان کے لئے کیا ہے هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ دیکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں دعوت دی جاتی ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے اپنی محنت کے حاصل کو کھلا رکھو فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ۔ مگر تم میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کے باوجود سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لیتے ہیں۔ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ سو یاد رکھو جو شخص اس طرح سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لیتا ہے اور دوسروں کو سامانِ نشوونما سے محروم رکھتا ہے تو وہ سمجھ لے کہ وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ خود اپنی ذات کو سامانِ نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ باقی رہا اللہ۔ سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ وَّاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ تم اس کے محتاج ہو وہ تمہارا محتاج نہیں۔ وہ کسی کا بھی محتاج نہیں۔ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا۔ ان سے کہدو کہ اگر تم اس طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت سے روگردانی کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا۔ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)۔ اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

یہ ہے قوموں کی ہلاکت سے مفہوم۔ مندرجہ بالا آیت کا آخری ٹکڑہ۔ (ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ) قابلِ غور ہے۔ یعنی یہاں ہیگل اور مارکس کا فلسفۂ تاریخ کارفرما نہیں کہ ایک قوم (تصور یا نظام) کی جگہ بہرحال دوسری قوم نے لینی ہے خواہ یہ دوسری قوم کسی قسم کی کیوں نہ ہو۔ یہاں قانون یہ ہے کہ تبدیل وہ قوم کی جا سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ اور اس کی جگہ وہ قوم لیتی ہے جو اُس (جانے والی) قوم سے بہتر ہوتی ہے اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ (۷۰/۴۱) ہم اس پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر قوم کو ان کی جگہ بدل کر لے آئیں۔

یہ ہے خدا کا وہ اٹل قانون جس کی شہادت تاریخ کے صفحات پیش کرتے ہیں۔ اور یہی ہے وہ حقیقت جس تک پہنچنے کے لئے اس نے تاریخ کے مطالعہ پر اس قدر زور دیا ہے۔ وہ اقوامِ حاضر کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

اقوامِ سابقہ کی تاریخ

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ۔ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِھِمْ
وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہٗ کَانَتْ تَّاْتِیْھِمْ رُسُلُھُمْ
بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا فَکَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَی اللّٰہُ۔ وَاللّٰہُ
غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝ (۶۴/۵-۶)

کیا تمہارے پاس اقوامِ سابقہ کی تاریخ نہیں پہنچی۔ یعنی ان اقوام کی جنہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار کیا سو انھوں نے اپنی غلط روش کا تباہ کن انجام دیکھ لیا۔ یعنی وہ دردانگیز سزا کے مستوجب بن گئے یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح قوانین لے کر آتے رہے (لیکن وہ ایک ایک کی تکذیب کرتے رہے) اور کہتے رہے کہ واہ! اب ہمارے جیسے انسان ہماری راہ نمائی کریں گے! سو انھوں نے اس کا انکار کیا اور ان قوانین سے روگردانی کی۔ (سو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑا) اللہ تو سب سے مستغنی ہے بالکل مستغنی اور ہر قسم کی حمد و توصیف کا مالک۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ استبدالِ قومی (ایک قوم کی ہلاکت اور اس کی جگہ دوسری قوم کا تمکن فی الارض) یونہی سوتے سوتے نہیں ہو جاتا۔ تباہ ہونے والی قوم کے اندر معاشرتی فساد رونما ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے جس سے ان کی قوت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ یہی خدا کا عذاب (یعنی ان کے اعمال کے نتائج اور ان کے جرائم کی پاداش) ہوتی ہے۔ اس عذاب کی کئی شکلیں ہیں۔ لیکن ان میں سب

عذاب کی شکل

سے نمایاں شکل وہ ہے جسے قرآن نے سورۂ انعام میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے قُلْ ھُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔ اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّھُمْ یَفْقَھُوْنَ (۶/۶۵) ان سے کہدو کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تمہارے اعمال کی سزا مختلف انداز میں وارد کر دے۔ (مثلاً) اس طرح کہ تمہارے اوپر مستبد اور جابر حکام مسلط ہو جائیں جو اپنے جور و ستم سے روند ڈالیں۔ یا معاشرہ کے عوام نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اس طرح نظم و نسق کو تہس نہس کر دیں۔ یا اوپر کا طبقہ (لیڈر) عوام کو اپنے ساتھ ملا کر مختلف پارٹیاں بنا لے اور اس طرح یہ پارٹیاں آپس میں سر پھٹول شروع کر دیں۔ یہ ہیں باہمی جنگ و جدال کی وہ مختلف شکلیں جن سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جاتا ہے اور اس طرح تم سے حکومت و سطوت چھن کر کسی دوسری قوم کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ اس قسم کی خانہ جنگیوں میں، یا مختلف (مستبد) اقوام کی باہمی آویزشوں میں ہوتا یہ ہے کہ جو زیادہ قوت فراہم کر لیتا ہے وہ دوسروں پر بزور مسلط ہو جاتا ہے۔ وَکَذٰلِکَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۶/۱۲۹) لیکن مستبد قوتوں کا اس قسم کا غلبہ و تسلط، انھیں ثبات و دوام عطا نہیں کرتا۔ یہ محض وقتی اور ہنگامی تغلب ہوتا ہے۔ اگر محض قوت کی بنا پر قوموں کو دوام نصیب ہو جاتا تو دنیا کی کئی قومیں آج تک برسرِ اقتدار ہوتیں۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ چونکہ ان کا تصورِ حیات غلط اور نظریۂ زندگی باطل تھا اس لئے وہ، اپنی قوت و سطوت کے باوجود

محض قوت سے دوام نہیں ملتا

تباہ و برباد ہو گئیں وَكَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۳۰/۹ ؛ ۴۰/۲۱ ؛ ۴۱/۱۵ ؛ ۴۷/۱۳) یہ بھی نہیں کہ یہ قومیں جاہل اور گنوار، وحشی اور غیر مہذب تھیں۔ وہ علم و ہنر کی مالک اور تہذیب و تمدن کی حامل تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھنے بھالنے والی تھیں (وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۔ ۲۹/۳۸) ان کے پاس ذرائع علم سب موجود تھے۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً (۴۶/۲۶) وہ سماعت و بصارت اور قلب سب کچھ رکھتے تھے لیکن چونکہ وہ قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے اور اس کے خلاف زندگی بسر کرتے تھے۔ اسلئے ان کا علم و ہنر ان کے کسی کام نہ آیا فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ (۴۶/۲۶) قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ سب سے پہلے خرابیاں قوم کے اوپر کے طبقے سے شروع ہوتی ہیں۔ جو مرفہ الحال اور دولت مند ہوتا ہے وہ

سرمایہ پرستوں کی طرف سے ابتدا

دوسروں کی کمائی پر عیش اڑاتے ہیں اور اسی روش پر چلے جاتا چاہتے ہیں۔ وَاتُّبِعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ (۱۱/۱۱۶) انہی کو دوسری جگہ اکابر مجرمین کہا گیا ہے جو مختلف قسم کی سازشیں کرتے رہتے ہیں تاکہ نچلا طبقہ ان کی ہوسناکیوں کا آلہ کار بنا رہے۔ حالانکہ یہ سازشیں خود ان کی اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہیں لیکن وہ اس بات کو سمجھتے نہیں (۶/۱۲۳) اس طرح معاشرہ میں خرابیاں عام ہوتی چلی جاتی ہیں اور کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو ان ناہمواریوں کا سدباب کر سکے (۱۱/۱۱۶) جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو وہ قوم اپنے سامانِ معیشت کی فراوانیوں کے باوجود (بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۔ ۲۸/۵۸) تباہ و برباد ہو جاتی ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہ تباہی کہیں باہر سے نہیں آتی۔ یہ خانہ ویرانی ان کے اپنے ہاتھوں سے ہوتی ہے (يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ ۵۹/۲) اس سے وہ قوم قرآن کے الفاظ میں "کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے انگارے" کی طرح ہو جاتی ہے (وَجَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ۔ ۲۱/۱۵) اور تاریخ کے صفحات پر اس کی فقط داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ (۲۳/۴۴) ان کی آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ ان کے کنویں بے کار ہو جاتے ہیں۔ ان کے محلات کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں (۲۲/۴۵) یہی ہیں وہ کھنڈرات جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان کا مشاہدہ کرو فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (۲۷/۷۶) اور دیکھو کہ مجرمین کا انجام کیا ہوا؟ لیکن یہ انجام انہی کو نظر آ سکتا ہے جو آنکھیں رکھتے ہیں۔ وہ آنکھیں نہیں جو ماتھے میں گڑی ہوتی ہیں بلکہ وہ آنکھیں جو دل کے اندر ہوتی ہیں فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶) اس لئے کہ جب انسان اندھا ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ماتھے کی آنکھیں جاتی رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہی۔

خوش بخت ہیں وہ قومیں جو تاریخی شواہد سے اپنے اعمالِ حیات کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں کہ قرآن نے تاریخ کے مطالعہ کا یہی مقصد بتایا ہے لیکن جو قوم محض مُردوں کو ثواب پہنچانے کی خاطر قرآن پڑھے وہ اس سے کیا فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔

مجلسِ اقبال

رموزِ بیخودی۔ در معنیٔ ایں کہ ملت از اختلاطِ افراد پیدا می شود و تکمیلِ تربیتِ او از نبوت است۔

گذشتہ باب میں علامہ اقبال نے فرد و ملت کے باہمی رابطے سے آغازِ سخن کیا تھا لیکن تھوڑی دور چل کر انسانی ذات کی اہمیت سامنے آگئی تو باقی حصہ اسی کے لئے وقف ہو گیا۔ زیرِ نظر باب کے پہلے حصہ کو اسی کا تکملہ سمجھنا چاہیئے۔ البتہ اس کے دوسرے حصہ میں انھوں نے ایک نہایت اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور وہ یہ کہ افراد کے یونہی جمع ہو جانے سے ملت کی تشکیل نہیں ہو جاتی۔ ان میں یکجائی مقصد اور ہم آہنگیٔ قلب و نظر کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس قسم کی یک نگہی اور یک جہتی ایک عظیم شخصیت کی تعلیم پیدا کر سکتی ہے جسے نبی کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کے اس اساسی نکتہ کو قرآن ہی نے بیان کیا ہے کہ نبی صرف انفرادی تعلیم دینے کے لئے نہیں آتا بلکہ ایک امت کی تشکیل کرنے کے لئے آتا ہے جن میں وجۂ جامعیت اور قدرِ مشترک، اس نبی کی تعلیم ہوتی ہے۔ چونکہ اس اجمال کی تفصیل کے لئے اقبال نے ایک الگ باب (رسالت) قائم کیا ہے (جو ذرا آگے چل کر آتا ہے) اس لئے ہم بھی اس کی تفصیل اُسی جگہ بیان کریں گے۔ زیرِ نظر باب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

از چہ رو بربستہ ربطِ مردم است　　　رشتۂ ایں داستاں سر در گم است
در جماعت فرد را بینیم ما　　　از چمن او را چو گل چینیم ما

افراد الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جداگانہ انفرادیت رکھتا ہے۔ اس انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے وہ کس طرح ایک "وحدت" بن سکتے ہیں۔ وہ کونسا رشتہ ہے جس سے وہ باہمی مربوط ہو سکتے ہیں۔ وہ رشتہ بڑا محبت کا ہے۔ جماعت اور افراد کی مثال ایسے سمجھئے جیسے پھول اور گلستاں۔ گلستاں پھولوں ہی سے عبارت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنی جداگانہ ہستی رکھتا ہے۔ پھول مل کر گلستاں بنتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی انفرادیت فنا نہیں ہوتی۔ یہی صورت فرد اور جماعت کی ہے

فطرتش وارفتۂ یکتائی است
حفظِ او از انجمن آرائی است

ذات منفرد ہوتی ہے اور منفرد رہنا چاہتی ہے۔ کوئی ذات کسی دوسری ذات کا نہ حصہ ہوتی ہے۔ نہ جزو بن سکتی ہے۔ یکتائی (اپنے آپ میں یکتا ہونا) ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ لیکن ذات کا تحفظ (اور تربیت) جماعت کے اندر ہو سکتا ہے۔ تنہا رہ کر نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کو اقبال نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو

افراد اور قافلہ لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن قافلے میں ہر فرد جہاں دوسرے افرادِ کارواں کے ساتھ چلتا ہے۔ وہاں اپنی جداگانہ انفرادیت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ لیکن راہ رو کو قافلہ اور فرد کو جماعت کے بغیر چارہ ہی نہیں کشمکشِ حیات میں جماعت ہی فرد کی محافظ اور اس کی پختگی کے لئے آتش افروز ہوتی ہے۔

سوزدش در شاہراہِ زندگی
آتشش آوردگاہِ زندگی

اسی کشمکش کا نتیجہ ہے کہ

مردماں خوگر بیک دیگر شوند
سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند

انسان ایک دوسرے سے اُنس و محبت کرنے لگتا ہے وہ معاشرہ میں رہنا سیکھتا ہے۔ اس کی وحشت موانست سے بدل جاتی ہے۔ اور اس طرح یہ تمام افرادِ معاشرہ موتیوں کی مالا کی طرح ایک رشتہ میں پروئے جاتے ہیں۔

در نبردِ زندگی یارِ ہم اند
مثلِ ہمکاراں گرفتارِ ہم اند

وہ جہادِ زندگی میں ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کے سامنے ایک ہی نصب العین ہوتا ہے اور ایک ہی مقصد اس لئے وہ آپس میں ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے رہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا۔

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است
ہستیٔ کوکب ز کوکب محکم است

یہ ستاروں کی محفل جو فرشِ نیلگوں پر اس طرح ضیا بار دکھائی دیتی ہے اس کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے؟ اس طرح کہ ایک ستارہ دوسرے ستارے کو اپنی طرف کھینچے رہتا ہے۔ اور یوں یہ سب ایک دوسرے کے لئے موجبِ تقویت بنتے ہیں۔

اس کے بعد اقبال یہ بتاتے ہیں کہ ایک صاحبِ دل (نبی) کے بغیر اس کائنات کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ دیکھئے کہ انہوں نے ذیل کے اشعار میں اس کا نقشہ کس طرح کھینچا ہے (اقبال نے اگرچہ اس کیفیت کو زمانہ حال کے انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن ہم

سمجھتے ہیں کہ اگر اسے ماضی کے انداز سے بیان کیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ یعنی اس انداز سے کہ نبوت سے پہلے اس کائنات کی حالت اور عالمِ انسانیت کی کیفیت کیا تھی؟ اور پھر نبی کی تشریف آوری نے اس میں کیا تبدیلی پیدا کر دی۔

خیمہ گاہِ کاروانِ کوہ دجبل
رغزار و دامنِ صحرا و تل

یہ وسیع و عریض طبیعی کائنات۔ یہ پہاڑ۔ یہ میدان۔ یہ صحرا۔ یہ ٹیلے۔ یہ باغات۔ غرضیکہ یہ تمام کارگہ ہست و بود۔ جب اس میں کوئی دھڑکنے والا دل نہ تھا تو سوائے ایک تودۂ خاک کے اور کیا تھی؟

سست بنیاں تار و پود کارِ او
ناکشودہ غنچۂ پندارِ او

اس کائناتِ آب و گِل کا تمام کاروبار بے حس اور بے جان تھا۔ اس کا پندار دیے کا دیا۔ اس کی کشود کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔

ساز برق آہنگ او نانواختہ
نغمہ اش در پردہ نا پرداختہ

ہرچند اس کے پاس ایسا ساز موجود تھا جس کی آواز بجلی کی سی تھی۔ لیکن وہ ویسے کا ویسا رکھا تھا۔ نہ کوئی ساز نواز تھا نہ مضراب اس لئے اس کے تاروں میں نغمے خوابیدہ کے خوابیدہ تھے۔ یعنی اس کائنات کی تمام صلاحیتیں دبی ہوئی تھیں۔ ان کی نہ نمود ہو سکتی تھی نہ نشوونما۔

گوشمالِ جستجو ناخوردۂ
زخمہ ہائے آرزو ناخوردۂ

اس کائنات میں نہ کوئی محقق ایسا تھا جو اس کے مستور حقائق کی تجسس کرے۔ نہ کوئی زخمہ ور ایسا جو اس کے تاروں میں خوابیدہ نغموں کو فردوسِ گوش بنائے۔

ناں اماں محفلِ نو زادہ اش
نی تواں باپنبہ چیدن بادہ اش

اس کی محفل جو نئی نئی وجود میں آئی تھی بغیر کسی ساز و سامان اور آرائش و زیبائش کے تھی۔ نہ اس میں رنگ و چنگ۔ نہ ساز و آہنگ نہ ساقی نہ دورِ جام۔

نو دمیدہ سبزۂ خاکش ہنوز
سرد خوں اندر رگِ تاکش ہنوز

اس کی زمین سے سبزہ کی ابھی ابھی نمود ہوئی تھی۔ اس کے انگور کی رگوں میں خونِ زندگی بالکل سرد تھا۔ نہ سبزہ میں کوئی تازگی اور شادابی۔ نہ رگِ تاک میں حرارت و حدت۔

منزلِ دیو و پری اندیشہ اش
از گمانِ خود رمیدن پیشہ اش

اُس دور میں ذہنِ انسانی توہم پرستیوں میں گرفتار تھا۔ وہ اس قدر ناپختہ تھا کہ اپنے سایہ سے آپ ڈر کر بھاگ جاتا تھا۔

تنگ میداں ہستیِ خامش ہنوز
فکرِ او زیرِ لبِ بامش ہنوز

اس کی ناپختہ ہستی کی دنیا بڑی سکڑی اور سمٹی ہوئی تھی۔ نہ نگاہ میں وسعت، نہ ذہن میں کشاد۔ نہ فکر میں بلندی۔

بیمِ جاں سرمایۂ آب و گلش
ہم ز بادِ تندے لرزد دلش

ہر وقت جان کا دھڑکا۔ ذرا تیز ہوا چلی اور اس کا دل ڈوبا۔

جانِ او از سخت کوشش رم زند
پنجہ در دامانِ فطرت کم زند

محنت و مشقت، سختی اور خارہ شگافی کے تصور سے اس کی روح کانپتی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر گریبانِ فطرت کو چاک کرنے نہیں رکھتا تھا۔

ہرچہ از خود می دمد بردارد ش
ہرچہ از بالا فتد بردارد ش

فطرت نے جس حالت میں کسی چیز کو دیا اُسے اُسی حالت میں لے کر استعمال کر لیا۔ اشیائے فطرت میں اپنی منشا اور ضرورت کے مطابق تبدیلیاں پیدا کرنے کا تو خیال ہی نہیں آسکتا تھا۔ جو بلا آسمان سے آتی تھی وہ اُسے چپکے سے برداشت کر لیتا تھا۔ نہ اس سے حفاظت کا سامان تیار کرتا تھا۔ نہ اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت۔

وحی کی روشنی سے پہلے اس کائنات اور اس میں بسنے والے انسان کی یہ حالت تھی۔ بے خبر، ناپختہ و خام۔ کمزور اور ناتواں۔ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والا۔

تا خدا صاحب دلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند

ان حالات میں خدا ایک صاحبِ دل کو پیدا کر دیتا ہے۔ وہ آ کر ایک حرف سے دفتر کے دفتر مرتب کر کے رکھ دیتا ہے۔

ساز پردازے کہ از آوازِ او
خاک را بخشد حیاتِ تازۂ

وہ ایسا نے نواز ہوتا ہے کہ اپنی اُس آواز سے جو دین اور دنیا کے دونوں مقامات کا سنگم ہوتی ہے، انسان کے پیکرِ خاکی کو ایک نئی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

ذرۂ بے مایہ ضو گیرد ازو
ہر متاعے ارجِ نو گیرد ازو

اس سراجاً منیرا کی روشنی سے ایک ذرۂ ناچیز بھی انجمِ درخشندہ بن جاتا ہے۔ وہ زمانے کو نئی اقدار عطا کرتا ہے جس سے ہر جنس کی قیمت بدل جاتی ہے۔

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند
محفلے رنگیں زیک ساغر کند

وہ اپنی مسیحا نفسی سے سینکڑوں بے جان پیکروں کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ وہ ایک ساغر سے محفل کی محفل رنگین بنا دیتا ہے۔

دیدۂ او می کشد لب۔ جاں دہد
تا دلِ مسیر دیگی پیدا شود

جس کسی کا لبِ مشتاق اس کی نگہِ پر کیف سے شرابِ حقیقت کے دو گھونٹ پی لیتا ہے اس کی جانِ ناتواں میں ایک تازہ شگفتگی اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح غیریت کا پردہ درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ اور اس میخانے کے بادہ نوش سب یک رنگ و ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

رشتۂ اش کو بر فلک دارد سرے
پارہائے زندگی را ہمگرے

اس کا پیغام جس کا سرچشمہ عرشِ الٰہی ہوتا ہے، یعنی اس کی وحی جو منزل من اللہ ہوتی ہے۔ زندگی کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ دیتی ہے۔ حیات ایک غیر منقسم وحدت ہے اور نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری۔ لیکن انسان کی خود ساختہ حدود نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔ وحیِ خداوندی ان منتشر ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے ان میں پھر سے وحدت پیدا کر دیتی ہے۔

تازہ اندازِ نظر پیدا کند
گلستاں در دشت و در پیدا کند

وہ نگاہوں کو نیا زاویہ عطا کر دیتا ہے۔ اور اس طرح زندگی کے ان گوشوں کو جہاں تازگی اور شادابی کا نام و نشان نہ تھا، دامانِ باغبان و کفِ گلفروش بنا دیتا ہے۔

از تعب او ملتے مثلِ سپند
بر جہد شور افگن و ہنگامہ بند

اس کی پیدا کردہ حرارت سے، اس کی متبع قوم ساری دنیا میں انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ ہر طرف تازہ ولولوں اور پرُجوش ہنگاموں کا شور سنائی دیتا ہے۔ اور وہی دنیا جو اس سے پیشتر قبرستان کی طرح خاموش تھی، اس صورِ اسرافیل سے حشر بداماں ہو جاتی ہے۔

یک شرر می افگند اندر دلش
شعلۂ درگیری گردد گلش

وہ افسردہ سینوں کے خس و خاشاک میں ایک چنگاری پھینک دیتا ہے جس سے اس کا پیکرِ خاکی شعلۂ جوالہ بن جاتا ہے۔

نقشِ پایش خاک را بینا کند
ذرہ را چشمک زنِ سینا کند

اس کا نقشِ قدم خاکِ بے بصر کو بینائی عطا کر دیتا ہے۔ جو ذرہ اس کے قدموں کو چوم لیتا ہے وہ رشکِ صد طور بن جاتا ہے۔

عقلِ عریاں را دہد پیرایۂ
بخشد ایں بے مایہ را سرمایۂ

وحی کے بغیر انسانی عقل کو یوں سمجھئے جیسے وہ یکسر برہنہ ہو اور اس لئے محفلِ علم و بصیرت میں آنے سے گھبراتی اور شرماتی ہو۔ اُس نبی کی وحی، عقل کو لباس عطا کر دیتی ہے اور اس طرح وہ اُس بے چیز کو گراں قدر بنا دیتی ہے۔

دامن خود می زند بر اخگرش
ہرچہ غش باشد ربایداز زرش

وہ وحی کرتی یہ ہے کہ عقل کے دہکتے ہوئے کوئلوں کو اپنے دامن سے ہوا دیتی ہے جس سے اس کی خاکستر الگ ہو جاتی ہے۔ اور بلا آمیزش آگ باقی رہ جاتی ہے۔ وہ سنار کی کٹھالی کی طرح عقل کو اپنی آگ میں تپاتی ہے۔ اور اس کا کھوٹ الگ کر کے زرِ خالص کو اس سے جدا کر لیتی ہے۔

بندہا از پا کشاید بندہ را
از خداوندان رباید بندہ را

وہ انسانوں کے پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیروں کو توڑ کر انھیں مستبد آقاؤں کی غلامی سے آزاد کر دیتا ہے۔

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ
زیں بتانِ بے زباں کمتر نۂ

وہ انسان سے کہتا ہے کہ تو کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں بن سکتا۔ تو ان سے کسی صورت میں بھی کم نہیں۔ تمام انسان، بحیثیت

انسان ہونے کے یکساں واجب التکریم ہیں۔

وہ اپنے حقیقت کشا پیغام سے بکھرے ہوئے انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کرتا ہے۔ ان کے سامنے ایک بلند و بالا نصب العین رکھ دیتا ہے۔ اور پھر قوانین خداوندی کی اطاعت سے انھیں اس راستے پر رواں دواں لے کر چلتا ہے جو انھیں اس نصب العین تک پہنچا تا ہے۔

نکتۂ توحید باز آموزدش

رسم و آئینِ نیاز آموزدش

وہ انھیں توحید کا نکتہ سکھاتا ہے۔ یعنی یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں اطاعت صرف قوانین خداوندی کی جائز ہے اور کسی کی نہیں۔ اور اس طرح یک نگہی و ہم مقصدی سے ان منتشر افراد کو ایک زندہ و پائندہ جماعت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اس شعر پر اس باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے باب میں وہ توحید کی مزید تشریح کرتے ہیں جو حسب ذیل ہے۔

ارکان اساسی ملّیہ اسلامیہ

رُکنِ اوّل ———— توحید

سابقہ باب میں علامہ اقبال نے کہا تھا کہ منتشر افراد کو ملت کی شکل میں نبی کا پیغام منضبط کرتا ہے۔ یہ ہیئتِ اجتماعیہ چند ارکان پر استوار ہوتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا۔ اہم اور بنیادی رکن توحید ہے۔ توحید کے معنی اتنے ہی نہیں کہ ہم ایک خدا کو مانتے ہیں ایک سے زیادہ نہیں مانتے۔ توحید کے معنی یہ ہیں کہ خارجی کائنات اور خود انسانوں کی دنیا میں قانون صرف ایک خدا کا نافذ العمل ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کا قانون کار فرما نہیں۔ لہذا کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنے احکام و قوانین کا تابع بنائے۔ یہ ہے وہ حقیقی آزادی اور حریتِ کامل جو توحید پر ایمان سے نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جب دنیا کے تمام انسان (یا کم از کم ان کی اکثریت) ایک ہی قانون کو اپنے لئے ضابطۂ حیات قرار دے لیں، تو وہ سب ایک ملت یا قوم بن جائیں گے اور ایک ہی حکومت اور ایک ہی مرکز کے تابع زندگی بسر کریں گے۔ اس طرح وہ (one-world Government) وجود میں آجائے گی جس کے خواب دورِ حاضر کے سیاسی مفکر مدت سے دیکھ رہے ہیں لیکن جس کی تشکیل کی کوئی تدبیر اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ جو انسانی دنیا میں اس قدر تشتت و انتشار اور اختلاف و افتراق پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم اپنی اپنی عقل کے مطابق اپنا نظام قائم کرتی ہے۔ اور چونکہ عقل کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس فرد یا قوم کے مفاد کا تحفظ کرے۔ اور صرف اس کے مفاد کا تحفظ کرے۔ جس

کی وہ عقل ہے' اس لئے قوموں کے مفاد کا تصادم اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر افراد اور اقوام کی عقل وحی خداوندی کی روشنی میں کام کرے تو اساس و بنیاد کے مشترک ہونے کی وجہ سے) نہ انکے مفاد میں تصادم ہو۔ نہ عقول میں جنگ۔ یہ ہے وہ حقیقت جسے زیر نظر باب میں اجاگر کیا گیا ہو جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں:

درجہانِ کیف و کم گردید عقل   پے بہ منزل بُرد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست   کشتیِ ادراک را ساحل کجاست

چونکہ انسانی عقل، جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنے میں مصروف تگ و تاز رہتی ہے اور جذبات لحظہ بہ لحظہ اور آن بہ آن بدلتے رہتے ہیں، اس لئے عقل بیچاری بھی دنیا میں ماری ماری پھرتی رہتی ہے اور کسی منزل تک نہیں پہنچ پاتی۔ وحیٔ خداوندی تمام انسانوں کو ایک مشترکہ مقصد دیدیتی ہے جس کے حصول کے لئے ان سب کی عقول یک جہتی اور باہمی تعاون سے سرگرم رہتی ہیں۔ اس لئے عقول کی جنگ کی بجائے ان میں باہمی رفاقت پیدا ہو جاتی ہے اور کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ ورنہ تنہا عقل تو جذبات کی موجوں کے تھپیڑے کھاتی، گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح بے مقصد گھومتی رہتی ہے۔

اہلِ حق را رمز توحید از بر است
در اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا مضمر است

حقیقت شناس نگہ (مومن) اچھی طرح جانتی ہے کہ توحید سے اصل مقصود کیا ہے اور اسے سمجھنے کے لئے تو قرآن کی ایک آیت ہی کافی ہے۔ سورۂ مریم میں ہے۔ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (19/93) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی شے ایسی نہیں جو خدائے رحمٰن کے احکام کی پابند ہو کر اس کے حضور اس کی غلام بن کر نہ آئے۔ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ۔ ہر شے اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ یہی توحید کا عملی مفہوم ہے۔

تا ز اسرارِ تو بنماید ترا
امتحانش از عمل باید ترا

اب سوال یہ ہے کہ انسان، ان قوانین کی اطاعت کیوں کرے؟ کیا یہ اطاعت اس قسم کی ہے جیسے کسی مستبد حاکم کے احکام کی اطاعت کی جاتی ہے؟ قطعاً نہیں۔ وہ تو بجبر و اکراہ محکومی ہوتی ہے اور اطاعت بطیبِ خاطر کی جاتی ہے۔ نیز، کیا ان قوانین کے منوانے میں خدا کا کوئی اپنا مقصد پنہاں ہے؟ قطعاً نہیں۔ خدا تو غنی عن العٰلمین ہے۔ اس کا کونسا کام رُکا ہوا ہے جسے وہ انسانوں کی اطاعت سے پورا کرانا چاہتا ہے؟ تو اس اطاعت سے مقصود کیا ہے؟ مقصود یہ ہے کہ اس سے انسانی ذات کے مضمر جوہروں کی نمود ہوتی ہے۔ اس کی نشو و نما ہوتی ہے۔ لیکن یہ نشو و نما صرف ان قوانین کی صداقت کو تسلیم کر لینے (ایمان) سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ضروری ہے اسے عمل صالح کہتے ہیں۔ انہی اعمال سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی ذات کی کس حد تک نشو و نما ہو چکی ہے۔

دیں از و حکمت از و آئیں از و   زور از و قوت از و تمکیں از و

دین و دانش اور قوانین و دستور کا مرکزی نقطہ توحید ہی ہے۔ اور اسی کے مطابق معاشرہ کے قیام سے حکومت و سلطنت اور قوت و ثروت حاصل ہوتی ہے۔ جب انسان کسی اور کے سامنے نہ جھکے تو اس سے بڑی قوت اور کیا ہو سکتی ہے؟

عالماں را جلوہ اش حیرت دہد
عاشقاں را بر عمل قدرت دہد

جو لوگ رموزِ کائنات میں تحقیق و جستجو کرتے ہیں، وہ علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیتے ہیں کہ کس طرح ایک ہی قانون ہے جو ذرہ سے خورشید تک ہر شے کو محیط ہے اور اس کے مطابق اس کارگہِ کائنات کا نظم و نسق اس حسن و خوبی سے سرانجام پا رہا ہے، وہ اس حقیقت کے مشاہدہ سے ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ نظری علم سے آگے بڑھ کر عملی قدم بھی اٹھاتے ہیں، تو یہی چیز ان کے لئے ثبات و استقلال کا موجب اور عزم و ہمت کا باعث بن جاتی ہے۔

پست اندر سایہ اش گردد بلند
خاک چوں اکسیر گردد ارجمند

انسان کتنی ہی پستیوں میں گھرا ہوا ہو، جب اس کے سائے تلے آ جائے تو اُسے دُنیا بھر کی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ اگر کفِ خاک اس بارگاہ میں پہنچ جائے تو اس کی قیمت اکسیر سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

قدرت او برگزیند بندہ را
نوعِ دیگر آفریند بندہ را

توحید میں اتنی قوت ہے کہ اس سے انسان کو دنیا بھر کی فضیلتیں مل جاتی ہیں۔ توحید پرست قوم، اقوامِ عالم میں منتخب و ممتاز ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے انسان کسی اور نوع کی مخلوق بن جاتا ہے

در رہِ حق تیز تر گردد تگش
گرم تر از برق خوں اندر رگش

اس سے حق و صداقت کے راستے میں اس کی تگ و تاز تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور اُس کی رگوں میں خون بجلیاں بن کر دوڑتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تیز رفتار۔

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات
چشم می بیند ضمیرِ کائنات

اس سے خوف اور شکوک کے تمام بادل چھٹ جاتے ہیں اور انسانی اعمال میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے انسان کی چشم بینا رموزِ کائنات کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی اور اس کے قلب میں اُتر جاتی ہے۔

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

جب انسان قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت میں محکم ہو جاتا ہے تو اس کا کاسۂ گدائی، جامِ جمشید میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ فقیرِ بے نوا مالک تاج و سریر ہو جاتا ہے۔

یہ ہے توحید یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے احکام و قوانین کے سامنے جھکا جائے بجز ذاتِ باری تعالےٰ کے۔ اور یہی وہ توحید ہے جس کی حامل اُمتِ محمدیہ ہے۔

ملتِ بیضا تن و جاں لَا اِلٰہ
ساز ما را پردہ گرداں لَا اِلٰہ

یہ اُمتِ مسلمہ ایک جسدِ بے جان کی طرح ہے جس میں زندگی اور جان لَا اِلٰہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے تاروں میں جس قدر نغمے پوشیدہ ہیں، وہ اسی مضراب سے بیدار ہوتے ہیں۔

لَا اِلٰہ سرمایۂ اسرار ما
رشتۂ اش شیرازۂ افکار ما

ہمارے رموز و اسرار اور نظریات، و تصورات کی متاعِ گراں بہا، لَا اِلٰہ ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جس سے ہمارے افکار کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد ہماری فکر و دانش گردش کرتی ہے۔ یہی وہ وحدت ہے جس سے وابستگی ہماری پریشاں خیالی کو ایک مرکز پر مرکوز کر دیتی ہے۔

حرفش از لب چوں بدل آید ہمے
زندگی را قوت افزاید ہمے

جب لَا اِلٰہ کے الفاظ زبان سے نیچے اُتر کر دل تک پہنچ جاتے ہیں تو زندگی میں نئی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں اس سے انسان کی دنیا بدل جاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس سے انسان کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب نگاہ کا زاویہ بدل جائے تو یہ خارجی کائنات خود بخود بدل جاتی ہے۔ اس لئے کہ ـــــ قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ۔

نقش او گر سنگ گیرد دل شود
دل گر از یادش نسوزد گل شود

اگر پتھر نقشِ توحید کو اپنے اندر جذب کرلے تو وہ جیتا جاگتا دھڑکنے والا دل بن جائے۔ اور دل، توحید کی یاد سے غافل ہو جائے تو وہ خاک بن کر رہ جائے۔ یہ پیکرِ آب و گل (کہ جسے ابن آدم کہتے ہیں) انسان کہلانے کا مستحق صرف اُسی وقت ہوتا ہے

جب اس میں توحید کی روح پھونک دی جائے۔ جس دل میں اس کی حرارت نہ ہو، وہ دل نہیں پارۂ سنگ ہے اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً۔

چوں دل از سوزِ غمش افروختیم
خرمنِ امکاں ز آہے سوختیم

جب ہم (ملتِ اسلامیہ) نے توحید کے اثر سے اپنے دل میں سوز و گداز پیدا کر لیا تو اس سے ہمارے پیکرِ خاکی میں وہ شعلے بھڑک اٹھے جن کی ایک لپٹ سے ہم نے اس جہانِ مستعار کو پھونک کر رکھ دیا۔ اور اس کی خاکستر سے اپنے لئے ایک نئی دنیا کی تعمیر کر لی جو ہمارے مخصوص تصوراتِ حیات کے لئے سازگار تھی۔

آب و تابِ دل ما در سینہ ھا
سوز او بگداخت ایں آئینہ ھا

ہمارے دلوں کی آب و تاب ہمارے سینہ میں جلوہ بار تھی۔ لیکن جب اس میں توحید کی آگ پہنچی تو اس نے اس آئینہ کو پگھلا کر پانی کر دیا۔

شعلہ اش چوں لالہ در رگہائے ما
نیست غیر از داغ او کالائے ما

ہماری عروقِ ملت میں توحید کی آگ، گلِ لالہ کی طرح شعلہ خیز ہے۔ اس آگ سے جو داغ پیدا ہوتا ہے (جس طرح لالہ میں داغ ہوتا ہے) وہی داغ درحقیقت ہمارے لئے سرمایۂ زندگی ہے۔

اسود از توحید احمر می شود
خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

توحید کے اشتراک سے نسل، رنگ، زبان، وطن کے تمام امتیازات مٹ کر، انسانوں میں حقیقی اشتراک اور مساوات پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حبش کا سیاہ فام غلام (بلالؓ) عرب کے فاروقِ اعظمؓ اور بوذر غفاریؓ کا اپنا (بھائی) بن جاتا ہے۔ اس انداز کی قلبی اور حقیقی یگانگت، توحید کے علاوہ کوئی اور چیز پیدا نہیں کر سکتی۔

دل مقامِ خویشی و بیگانگی است
شوق را مستی ز ہم پیمانگی است

انسانی دل میں محبت اور نفرت۔ یگانگت اور بیگانگی کے متضاد جذبات موجود ہیں اب سوال یہ ہے کہ اپنا کسے سمجھا جائے اور بیگانہ کسے۔ اس کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص توحید کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے، وہ اپنوں میں سے ہے، خواہ اس میں اور ہم میں کوئی اور وجۂ اشتراک نہ ہو۔ اور جو اس میں شریک نہیں وہ غیر ہے خواہ رشتہ کے اعتبار سے وہ ہمارا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وہ معیار ہے جس کے مطابق اسلام میں قومیت (ملت) کی تشکیل ہوتی ہے۔ دنیا کے جتنے افراد اس پیمانہ کے

بادہ نوش ہوں ان سب میں ایک ہی قسم کی سرستی پیدا ہوتی ہے۔

ملّت از یک رنگئ دلہاستے
روشن از یک جلوہ ایں سیناستے

ملت دلوں کی یک رنگی سے متشکل ہوتی ہے نہ کہ جسموں کے ایک جگہ رہنے سے۔ یہی وہ چراغ ہے جس سے مختلف ممالک اور اوطان میں ایک جیسی روشنی ہوتی ہے۔ اور اس روشنی کی یکسانی سے ہر قسم کی مغائرت دور ہو کر، ہم دلی پیدا ہو جاتی ہے۔

قوم را اندیشہ ہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے

قوم اسی وقت قوم بنتی ہے جب اس کے افراد کے تصورات و نظریات ایک جیسے ہوں۔ جب وہ سب ایک انداز سے سوچیں اور ایک انداز سے سمجھیں۔ جب ان کے سامنے ایک ہی نصب العین اور ان کے دلوں میں ایک ہی مقصد و مدعا ہو۔ فکر و نظر کی ہم آہنگی اور مقصد و مدعا کی یکسانیت، ہی وہ بنیاد ہے جس پر ایک قوم کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

جذبہ باید در سرشتِ او یکے
ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے

صرف فکر و نظر ہی نہیں، بلکہ ان کے جذبات بھی ایک جیسے ہونے چاہئیں۔ خارج میں کوئی واقعہ ہو، اس کا ردِ عمل تمام افراد کے دل میں یکساں پیدا ہونا چاہیئے۔ اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ان سب کے سامنے خیر اور شر کے پرکھنے کا معیار ایک ہو۔ اور یہ کیفیت صرف توحید سے پیدا ہو سکتی ہے۔

گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر
نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر

گر ہمارے قلب میں توحید کا سوز نہ ہو تو تمام افرادِ ملت میں اس قسم کا یکساں اندازِ فکر پیدا نہیں ہو سکتا۔

ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ
از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل

ہم مسلمان تو اپنا حسب و نسب بھی خون کے رشتوں سے متعین نہیں کرتے بلکہ توحید کے اشتراک سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کو (جو توحید کے سب سے نمایاں علمبردار تھے)، تمام افراد مومنین کا اَبْ (باپ) قرار دیا ہے اور اسلام کو ملۃ ابیکم ابرٰھیم (تمہارے باپ ابراہیم کا مسلک) قرار دیا ہے۔

با وطن وابستہ تقدیرِ اُمم　　　بر نسب بنیادِ تعمیرِ اُمم

دنیا نے قومیت کے مختلف معیار قرار دیئے ہیں۔ مثلاً وطن کا اشتراک۔ خون کا اشتراک۔ یعنی وطن اور نسل کا معیار۔

اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ
یا دد آب و گل پرستیدن کہ چہ

لیکن یہ تو انتہا درجہ کی سطح بینی اور کور نگہی ہے۔ اگر اتفاق سے مختلف نظریاتِ زندگی کے حامل کسی ایک جگہ بس گئے ہوں تو کیا انہیں ایک ملت کے افراد قرار دیدیا جائے گا؟ یہ تو محض مٹی اور پانی (کی مورتیوں) کی پرستش ہوئی جو باعثِ تذلیلِ شرفِ انسانیت ہے۔ یہ ہے اشتراکِ وطن کی حقیقت۔ باقی رہا اشتراکِ نسل کا سوال۔ سو

برنسب نازاں شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است

نسب پر نازاں ہونا بھی کمالِ نادانی ہے۔ اس لئے کہ نسب کا تعلق یکسر انسان کے جسم سے ہے۔ اور یہ حقیقت اب سائنس کی رُو سے بھی ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کا جسم ہر آن بدلتا رہتا ہے اور تین (یا زیادہ سے زیادہ سات) برس کے بعد اس پہلے جسم میں سے ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا وہ شے جو کچھ عرصے کے بعد باقی ہی نہیں رہتی، وہ کس طرح اساسِ ملت بن سکتی ہے

ملتِ ما را اساسِ دیگر است
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

ہماری ملت کی بنیاد نہ وطن پر ہے نہ نسل پر۔ اس کی اساس ہمارے دل کی گہرائیوں میں مضمر ہے۔ یعنی فکر و نظر اور احساسات و جذبات کی ہم آہنگی۔

حاضریم و دل بغائب بستہ ایم
بس زبندِ این و آں وارستہ ایم

اگرچہ ہم سب محسوس و مرئی پیکروں میں دکھائی دیتے ہیں لیکن ہم سب کے دل اس نظریۂ توحید سے وابستہ ہیں جو غیر محسوس و غیر مرئی ہے۔ لہٰذا، دنیا میں جس قدر محسوس معیارِ قومیت ہو سکتے ہیں ہم ان سب سے آزاد ہیں۔

رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است
چوں نگہ ہم از نگاہ ما گم است

وہ رشتہ جس سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں، اسی قسم کا غیر محسوس رشتہ ہے جس سے آسمان کے ستارے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور یہ رشتہ اس قدر لطیف اور غیر مرئی ہے جیسے نگاہ کا رشتہ خود نگاہ کو بھی دکھائی نہیں دیتا۔

(باقی صفحہ ۴۰ پر دیکھئے)

اسلام کی سرگزشت

(مسلسل)

محترم ڈاکٹر احمد امین مصری

(گذشتہ قسط میں عہد بنی امیہ کے اندر علمی حرکات اور چہل پہل کا بیان ہو رہا تھا۔ دینی علوم کی چہل پہل کے بعد تاریخی حرکت کا بیان کیا جا رہا تھا کہ اس چہل پہل پر نومسلم اقوام کس طرح اور کس کس نہج سے اثرانداز ہوئیں خصوصیت کے ساتھ یہودی، نصرانی اور ایرانی قومیں۔ یہ بیان ہنوز جاری ہے۔ طلوع اسلام)

مثال کے طور پر طبری کی یہ روایت دیکھیے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابراہیم بن مثنی نے بیان کیا ہے کہ ان سے عبداللہ بن صالح نے ابو معشر سے نقل کیا اور انھوں نے سعید بن ابی سعید سے کہ عبداللہ بن سلامؓ فرماتے تھے کہ حق تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق اتوار کے دن سے شروع فرمائی تھی۔ چنانچہ تمام زمینیں اتوار اور پیر کے دن پیدا فرمائیں۔ اور غذائیں اور پہاڑ وغیرہ منگل اور بدھ کے دن پیدا ہوئے اور آسمانوں کو جمعرات اور جمعہ کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن کی آخری ساعت میں وہ فارغ ہو گیا تھا۔ چنانچہ بڑی جلدی میں جمعہ کے دن ہی اس نے آدم کو پیدا کیا۔ اور یہی وہ ساعت ہوگی جس میں قیامت قائم ہوگی۔[۱] اس قسم کی بہت سی روایات ہیں جو انبیاء کرام کے واقعات کے سلسلہ میں قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح میں نقل کی گئی ہیں۔ ایرانیوں کے ہاں بھی ان کی اپنی تاریخ تھی اور تاریخ کے علاوہ کچھ ماضی کے افسانے بھی تھے جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو ان لوگوں نے اپنی تاریخی روایات اور اپنے ماضی کے افسانے بیان کرنے شروع کر دیئے۔ یہی کچھ نصاریٰ نے کیا کہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ساری روایات اور یہ سارے افسانے جو مختلف قوموں کے راستے سے آئے تھے مسلمانوں میں پھیلتے چلے گئے۔ اور مسلمانوں میں تاریخی حرکت کے سرچشموں میں سے ایک بڑا سرچشمہ خود یہ روایات اور افسانے ہی قرار پا گئے۔

---

[۱] [illegible] ۲۴

ان دونوں قسموں کو تاریخ سے زیادہ قصص اور افسانے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

(سوم) تیسری وجہ جو پہلی دو وجہوں سے بھی زیادہ اہم ہے یہ تھی کہ مسلمانوں نے شروع زمانے سے حدیثیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں احادیث میں ہر طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ نبی کریم صلعم اور صحابہ جو کچھ ـــــ عبادات، معاملات و جنایات کے متعلق تشریعی احکام وغیرہ میں ـــــ عمل فرماتے تھے ان کا بیان بھی ہوتا تھا اور وعظ و نصیحت کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ان میں ان تاریخی واقعات کا بیان بھی ہوتا تھا جن کی کوئی معمولی اہمیت نہیں تھی۔ چنانچہ جو احادیث نبی کریم صلعم کی مکہ مکرمہ میں حیات طیبہ سے متعلق ہیں یا ہجرت کے واقعات سے متعلق ہیں، یا مدینہ منورہ میں آپ کی حیات طیبہ سے تعلق رکھتی ہیں یا مختلف غزوات اور جنگوں سے وابستہ ہیں۔ ایسے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد کے حالات و واقعات اور حضرت عمر فاروقؓ کے عہد کی فتوحات وغیرہ۔ یہ سب تاریخی حوادث ہی ہیں جو احادیث ہی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض صحابہؓ کو ان امور سے خاص شغف تھا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بیان میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ یہ تاریخی احادیث آگے چلکر ان کتابوں کی بنیاد قرار پائیں جو بعد میں سیر اور مغازی کے موضوع پر لکھی گئیں۔ حتیٰ کہ یہ ایک الگ فن قرار پاگیا اور اس میں بہت کچھ اضافے کئے گئے۔ کیونکہ معتمد محدثین نے احادیث کے جمع کرنے میں جو اہتمام کیا ہے ان تاریخی واقعات کے نقل کرنے میں اس اہتمام سے بھی کام نہیں لیا گیا۔ اس کی دلیل کہ سیر اور مغازی کی کتابوں کی بنیاد دراصل حدیث ہی ہے وہ زبردست مشابہت ہے جو آپ احکام سے متعلق احادیث اور تاریخی روایات کے طریقۂ بیان اور اسلوب حکایت میں دیکھ سکتے ہیں۔

مسلمانوں نے عصر اول میں سیر و مغازی کے اس قسم کے واقعات کو خاص کتابوں میں الگ کرکے جمع کرنے کی طرف کافی توجہ دی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ وہب بن منبہ (۳۴ ـــــ ۱۱۰ھ) نے مغازی میں ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی۔ نیز عروہ ابن الزبیر ابن العوام (۲۳ ـــــ ۹۴ھ) نے جو مدینہ منورہ کے فقہا اور محدثین میں کافی شہرت رکھتے ہیں سب سے پہلے رسول اللہ صلعم کی سیرت پر ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی۔ اس طرح ان کے ہمعصر حضرت عثمان بن عفانؓ کے صاحبزادے حضرت ابانؓ (۲۲ ـــــ ۱۰۵ھ) نے بھی ایک کتاب سیرت رسولؐ میں لکھی تھی جسے ان کے ایک شاگرد عبدالرحمٰن ابن المغیرہ (متوفی پیشتر از ۱۲۵ھ) نے قلمبند فرمایا تھا۔

ایسے ہی مشہور ہے کہ ابن شہاب زہری (۵۱ ـــــ ۱۲۴ھ) نے بھی ایک کتاب مغازی میں جمع کی تھی۔ اسی طرح موسیٰ ابن عقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) نے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔[1]

بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ان کتابوں کی تالیف میں جس اسلوب کی پیروی کی گئی تھی وہ صرف سیرت یا مغازی سے متعلق حدیثوں کو ایک جگہ جمع کر دینے کا اسلوب تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ یہ باب پچھلے لوگوں کی بہ نسبت غالباً تاریخی کتابوں سے زیادہ قریب تھا۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس دور میں تاریخی حرکت کافی وسعت اختیار کر چکی تھی۔ اگرچہ اس پر دقیق

---

[1] مغازی سے متعلق موسیٰ کی اس کتاب کے کچھ حصے مل بھی گئے ہیں جو ۱۹۰۴ء میں طبع ہو چکے ہیں۔

علمیت کا رنگ ابھی تک نہیں چڑھ سکا تھا۔

کہانیاں اور قصص

اس تاریخی حرکت سے ان چیزوں کا بھی گہرا تعلق ہے جنھیں اس زمانہ میں قصص کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ابتداءِ اسلام ہی میں یہ چیز شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ابن شہاب زہریؒ سے نقل کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مسجد نبوی میں جس نے قصے بیان کئے وہ تمیم داریؓ تھے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے اجازت مانگی کہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کریں تو حضرت عمرؓ نے منع فرما دیا تھی کہ جب حضرت عمرؓ کی خلافت کا آخری زمانہ تھا تو حضرت عمرؓ نے حضرت تمیم داریؓ کو اس کی اجازت دیدی تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کے نکلنے سے پیشتر جمعہ کے روز لوگوں کو وعظ و نصیحت کر دیا کریں۔ ان کے بعد تمیم داریؓ نے حضرت عثمانؓ سے اجازت مانگی۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں ہفتہ میں دو مرتبہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ تمیم داریؓ اس کے مطابق عمل فرماتے رہے۔ حسن بصریؒ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ یہ قصے کہانیاں کب سے پیدا ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں۔ پھر سوال کیا گیا کہ سب سے پہلے یہ قصے کس نے بیان کئے؟ امام حسن بصریؒ نے فرمایا کہ تمیم داریؓ نے۔

یہ تمیم داریؓ نصرانی تھے اور یمن کے باشندے۔ سنہ ۹ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ انھوں نے رسول اکرمؐ کے سامنے جساسہ اور دجال کا قصہ[1] بیان کیا تھا۔ ان کی زندگی محض راہبانہ تھی جیسی کہ ان کے متعلق ابو نعیم نے کہا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے ایک راہب تھے۔ وعظ و نصیحت اور قصہ گوئی ایک نصرانی رجحان تھا جو ان کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی داخل ہو گیا اور آج تک چلا آ رہا ہے لوگوں کا بیان ہے کہ تمیم داریؓ ہی پہلے آدمی ہیں جنھوں نے مسجدوں میں چراغ روشن کئے اور جو آج تک روشن ہوتے چلے آتے ہیں۔

تمام روایات تقریباً اس پر متفق ہیں کہ وہ سب سے پہلے قصہ گو ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی قصہ گوئی کی نوعیت کس قسم کی تھی اور وہ کس قسم کے قصے بیان کیا کرتے تھے۔ لیکن جساسہ اور دجال کی حدیث اور ان کے دوسرے بہت سے منتشر اقوال سے ان کی عقلیت اور قصہ گوئی کا نمونہ اور روایات کا اسلوب بیان معلوم ہو سکتا ہے۔ مثلاً روح بن زنباع کی یہ روایت کہ وہ تمیم داری سے ملنے گئے تو اس نے انھیں گھوڑے کے لئے جَو صاف کرتے ہوئے پایا۔ ان کے ارد گرد ان کے گھر والے کھڑے تھے۔ روح نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ خدمت ان لوگوں میں سے کوئی آدمی انجام نہیں دے سکتا تھا؟ تمیم داریؓ نے کہا کیوں نہیں۔ لیکن میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو مسلمان آدمی اپنے گھوڑے کے لئے جَو صاف کرتا ہے اور پھر اس کے آگے ڈالتا ہے تو خدا اس ہر دانے کے بدلے میں ایک نیکی عطا فرمائے گا۔[2]

---

[1] اصابہ ص ۱۹۱ ج ۱۔ جساسہ کی حدیث یہ ہے کہ تمیم نے بیان کیا کہ وہ تیس آدمیوں کے ساتھ ایک سمندری جہاز پر سوار ہوئے۔ اس جہاز میں لخم اور جذام کے لوگ تھے موجیں ان کے جہاز کے ساتھ مہینہ بھر تک کھیلتی رہیں تا آنکہ وہ مغرب میں کسی جزیرہ پر اترے جزیرہ میں پہنچے تو انھیں ایک جانور ملا جس کے بدن پر بہت لمبے لمبے بال تھے (اس کے بعد اس جانور کی شکل و ہیئت بیان کی ہے) لوگوں نے اس جانور سے پوچھا کہ تیرا ناس ہو تو کیا چیز ہے اس جانور نے بتایا کہ میں جساسہ ہوں۔ اس کا نام جساسہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ خبریں معلوم کرتا پھرتا ہے اور دجال تک ان خبروں کو پہنچاتا ہے۔

[2] اسد الغابة ص ۲۱۵ ج ۲

اس قصہ گوئی کی شکل یہ ہوا کرتی تھی کہ قصہ گو مسجد میں بیٹھ جاتا تھا اور اس کے ارد گرد لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ وہ ان کو خدا کی آیات پڑھ کر سناتا اور نصیحت کرتا تھا۔ اور ان کے سامنے دوسری قوموں کے قصے، واقعات، حکایات اور کہانیاں وغیرہ سناتا تھا۔ ان احادیث وحکایات کے بیان کرنے میں وہ سند کی سچائی پر اپنا اعتماد نہیں کرتے تھے جتنا ترغیب و ترہیب کے مقصد پر اعتماد کرتے تھے۔ لیث بن سعد کہتے ہیں کہ قصے اور کہانیاں دو طرح کی ہوتی تھیں۔ عوام کے قصے۔ اور خواص کے قصے۔ عوام کے قصے تو یہ ہوتے تھے کہ لوگ کسی قصہ گو کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور وہ انھیں قصے کہانیاں سنا سنا کر وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ یہ قصہ گوئی ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔ اس کے لئے بھی جو یہ قصے بیان کرے اور ان کے لئے بھی جو ان قصوں کو سنیں۔ رہ گئے خواص کے قصے تو اس کی شکل وہ تھی جو امیر معاویہؓ نے اپنے عہد خلافت میں جاری کی تھی کہ انھوں نے قصہ گوئی کے لئے ایک خاص شخص کو مقرر کر رکھا تھا کہ جب امیر معاویہؓ صبح کی نماز کا سلام پھیرتے تھے تو وہ متعین شخص بیٹھ کر اللہ عزوجل کا ذکر کرتا تھا۔ اس کی حمد اور تمجید بیان کرتا۔ نبی اکرم صلعم پر درود بھیجتا۔ خلیفہ۔ اہل ولایت اور حشم اور افواج کے لئے دعائے خیر کرتا۔ اور اہل حرب کے لئے اور تمام مشرکین کے لئے بد دعا کرتا تھا۔[1]

قصہ گوئی کا یہ طریقہ بہت تیزی سے پھیل گیا کیونکہ عوام کے رجحانات سے میل کھاتا تھا۔ اور قصہ گویوں نے اس باب میں عجیب و غریب جھوٹ تراشے۔ حتیٰ کہ محدثین نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو مسجدوں سے جھڑک جھڑک کر نکال دیا تھا۔ اور صرف امام حسن بصری کو مستثنیٰ رکھا تھا کیونکہ وہ اپنے مواعظ میں اور قصص میں صرف سچی باتیں ہی بیان کرتے تھے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے مابین فتنہ کے دور سے یہ ایک سیاسی ادارہ بن گیا تھا کہ ہر فریق اپنے خیالات کی ترویج اور پروپیگنڈہ کے لئے اس سے مدد لیتا تھا۔ مثلاً لیث بن سعد نے اور ابن لہیعہ نے یزید بن حبیب سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے دعائے قنوت پڑھی اور ان لوگوں کے لئے بد دعا کی جو ان سے برسر پیکار تھے۔ اس کی اطلاع امیر معاویہؓ کو پہنچی تو انھوں نے ایک آدمی کو اس مقصد کے لئے مقرر کر دیا کہ وہ صبح کی نماز اور مغرب کی نماز کے بعد وعظ و نصیحت کیے۔ اور امیر معاویہؓ کے لئے اور اہل شام کے لئے دعائے خیر کیا کرے۔

قصہ گوئی کا مرتبہ اتنا بلند ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ ایک رسمی کام بن گیا جس پر باقاعدہ سرکاری طور پر لوگوں کو مقرر کیا جاتا اور انھیں اس کا معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کندی کی کتاب القضاۃ میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے قاضی موجود تھے جو ان قصہ گویوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کندی کہتے ہیں کہ مصر میں جس شخص نے سنہ ۳۸ھ میں قصہ گوئی کی ابتدا کی وہ سلیمان بن عتر تجیبی تھے۔ ان کے سپرد قضا اور قصہ گوئی کے دونوں وظیفے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کو قضا سے معزول کر دیا گیا اور صرف قصہ گوئی کا فریضہ ان کے سپرد رہا۔

ہمارے لئے یہ علمی نقطہ نگاہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ہمارے لئے ان کا وہ رنگ اہمیت رکھتا ہے جو جاہلیت سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قصے ہی وہ سرچشمہ تھے جس سے دوسری قوموں مثلاً یہودیت و نصرانیت کی بہت سی کہانیاں اور افسانے

---

[1] خطط المقریزی صفحہ ۲۵۳ ج ۲ طبع امیریہ۔

مسلمانوں میں داخل کر دیئے۔ تیسرا وہ دروازہ تھا جس کے راستے حدیث میں بہت سی جھوٹی روایتیں داخل ہوتی چلی گئیں۔ اسی چیز نے تاریخ کے فن کو بھی خراب کیا کہ غلط اور وضعی قسم کے حوادث اور فرضی کہانیاں اس میں گھستی چلی گئیں کہ آج ایک ناقد کے لئے ان کی تنقید کرنا دشوار کام بن گیا اور حقائق واقعات جن کے آگے ماند پڑ گئے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان قصہ گویوں کے ان دو بڑے سرچشموں کی طرف اشارہ کرتے جائیں جن کا ذکر ہیں ان قصوں کہانیوں کی روایات بلکہ تاریخ، حدیث اور تفسیر تک میں ملتا ہے۔ یہ دونوں سرچشمے وہب بن منبہؒ اور کعب الاحبارؒ تھے۔

وہب بن منبہؒ تو یمن کے باشندے ہیں اور ایرانی الاصل ہیں۔ یہ ان اہل کتاب میں سے ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ ان سے بہت سی روایات، قصے، کہانیاں اور خبریں نقل کی جاتی ہیں جن کا تعلق گذشتہ اقوام کے حوادث و واقعات۔ ابتدائے آفرینش علم اور قصص الانبیاء سے ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے خدا کی نازل کی ہوئی کتابوں میں سے بہتر ۷۲ کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کا انتقال ۱۱۰ھ کے لگ بھگ صنعاء میں ہوا تھا۔ رہ گئے کعب الاحبارؒ یا کعب ابن ماتع۔ تو یہ بھی یمن کے ایک یہودی ہیں۔ اور یہ وہ سب سے بڑا سرچشمہ ہیں جن کے ذریعہ یہودیوں کی تاریخی خرافات مسلمانوں میں گھس آئیں۔ یہ ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں (مختلف روایات کے مطابق) مسلمان ہوئے اور مسلمان ہونے کے بعد مدینہ منورہ اور پھر شام میں آکر بس گئے۔ ان سے دو آدمیوں نے بڑا استفادہ کیا اور یہی وہ دو آدمی ہیں جنہوں نے ان کے علم کو پھیلایا۔ ابن عباسؓ ـــــ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیری روایات میں اسرائیلیات کا بڑا حصہ ملتا ہے۔ ـــــ اور ابوہریرہؓ ـــــ کعب الاحبارؒ کے متعلق یہ چیز نقل نہیں کی جاتی کہ انہوں نے کوئی کتاب بھی تصنیف کی تھی جیسا کہ وہب بن منبہؒ کے متعلق نقل کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کی تمام تعلیمات ـــــ جو ہم تک پہنچی ہیں ـــــ محض زبانی تھیں۔ جو روایات ان سے نقل کی جاتی ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں یہودی ثقافت اور یہودی قصوں کہانیوں پر کافی عبور حاصل تھا۔ الطبقات الکبریٰ میں کسی آدمی کی ایک حکایت نقل کی گئی ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوا تو عامر بن عبداللہ بن عبدالقیس بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں میں تورات کے اسفار کے بھی کچھ نسخے تھے۔ کعب الاحبارؒ ان اسفار تورات کو پڑھتے رہتے تھے[1]۔ بعض محققین نے اس بات کو نوٹ کیا ہے کہ معتمد مصنفین جیسے ابن قتیبہ اور طبری ان کی کوئی روایت قطعاً نقل نہیں کرتے۔ ابن جریر طبری ان کی روایات نقل تو کرتے ہیں مگر کمی کے ساتھ لیکن دوسرے مصنفین ثعلبی اور کسائی وغیرہ قصص الانبیاء میں ان کی بکثرت نقل کرتے ہیں۔ مثلاً یہ زلیخا یوسفؑ اور ولید بن الریان کا قصہ وغیرہ۔ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ کعب الاحبارؒ حضرت عمرؓ بن الخطاب کی شہادت سے تین روز پہلے ان کے پاس گئے اور درخواست کی کہ آپ وصیت فرما دیجئے کیونکہ تین دن میں آپ کا انتقال ہو جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں تین دن میں مر جاؤں گا؟ کعب الاحبار نے جواب دیا کہ ہیں یہ چیز اللہ عزوجل کی کتاب تورات میں پا رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا تو عمر بن الخطابؓ کا تذکرہ تورات کے اندر بھی پاتا ہے؟

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۷۹ ج ۷

تو اس پر کعب نے کہا کہ نہیں بخدا آپ کا تذکرہ صراحۃً تو نہیں پاتا مگر آپ کا بیان اور آپ کا حلیہ اس کے اندر موجود ہے اور اس کی بناء پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کی زندگی ختم ہو چکی ہے۔

اگر یہ قصہ صحیح ہے تو اس سے صاف نظر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو قتل کر دینے کی جو سازش کی گئی تھی کعب الاحبار کو اس کی اطلاع تھی، اور انھوں نے اس اطلاع کی بناء پر ہی اسے اسرائیلیت کا یہ رنگ دیکر حضرت عمرؓ سے یہ گفتگو کی تھی۔ اس سے ہم یہ اندازہ بھی کر سکتے ہیں کہ جو باتیں وہ نقل کرتے تھے ان میں کس قدر وہ خود اپنی طرف سے گڑھ کر شامل کر دیتے تھے۔

مختصراً یہ ہے کہ ان لوگوں اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے عقیدہ اور علم میں وہ بہت سی باتیں داخل ہو گئیں جن کا اثر مسلمانوں پر اچھا نہیں ہوا۔

اکثر علماء نے زیادہ تر ملامت اور بعض طعن ان قصہ گویوں اور واعظوں پر ہی ڈالی ہے جیسا کہ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب الاحیاء میں کہا ہے اور ان کے اس عمل کو مساجد کے منکرات میں سے شمار کیا ہے کیونکہ یہ لوگ جھوٹ بولتے تھے۔ انھوں نے ان میں سے صرف حسن بصریؒ اور ان جیسے چند واعظوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حسن بصریؒ قصہ گو تو ضرور تھے مگر وہ دوسری نوعیت کے قصہ گو تھے۔ وہ ان لوگوں کی پیروی نہیں کرتے تھے جو اپنے وعظوں میں اسرائیلیات اور نصرانیات پر اعتماد کرتے تھے۔ بلکہ وہ اپنے مواعظ میں آخرت کو یاد دلانے وغیرہ پر زور دیتے تھے اور اس سے متعلقہ حوادث سے نصیحت کی باتیں مستنبط کر لیا کرتے تھے۔ وہ بصرہ میں مسجد کے آخری حصہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے گرد لوگوں کا ہجوم ہوا کرتا تھا جو مسائل فقہیہ اور ان فتنہ انگیز حوادث کے متعلق پوچھتے تھے جو ان کے زمانہ میں نمودار ہو رہے تھے۔ ان کے متعلق جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی تھیں وہ لوگوں کے سامنے بیان کر دیتے تھے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ ان کے مواعظ جو نقل کئے جاتے ہیں وہ زیادہ تر اس قسم کے ہوا کرتے تھے۔

"اے ابن آدم! خدا کو ناراض کر کے تو کسی کو راضی کرنے کی کوشش نہ کر۔ خدا کی نافرمانی کر کے کسی کی ہرگز اطاعت نہ کر۔ باوجودیکہ خدا کا تجھ پر فضل اور احسان برابر ہو رہا ہے۔ تو کسی دوسرے کی تعریف کر کے اپنی زبان کو آلودہ نہ کر۔ کسی کو ایسی چیز پر ملامت نہ کر جو خدا نے تجھے دی ہی نہیں۔ خدا نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا۔ ان میں سے جو لوگ گذر گئے وہ اپنے ان حالات پر گذر گئے جن میں خدا نے انھیں پیدا کیا تھا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی حرص سے اپنے رزق میں اضافہ کر سکتا ہے تو ذرا وہ اپنی حرص سے اپنی عمر میں اضافہ کر کے دکھلائے یا اپنا رنگ تبدیل کر کے اور اپنے جسم میں اور ہاتھوں پیروں میں اضافہ کر کے دکھلائے۔" یا ان کے مواعظ کا رنگ کچھ اس قسم کا ہوتا تھا کہ "اے ابن آدم! تیرا کوئی وجود نہ تھا۔ پھر تجھے پیدا کیا گیا۔ تو نے خدا سے اپنی ضروریات کے متعلق سوال کیا اور تجھے تیری ضروریات عطا کی گئیں لیکن جب تجھ سے کچھ مانگا گیا تو تو اس پر من کا سانپ بن کر بیٹھ گیا۔ کتنا برا طریقہ ہے یہ جو تو نے اختیار کیا ہے۔" وہ اس قسم کے مضامین کو مختلف عنوانوں سے بار بار بیان کرتے تھے۔ اس قسم کے ان کے اقوال عربی لٹریچر کی کتابوں میں منتشر طور پر بکثرت پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔

یہاں ایک بات اور بھی ہے جو یقیناً آپ کی نگاہوں میں کھٹک رہی ہوگی۔ وہ بات یہ ہے کہ ان مواعظ و قصص کے سرچشموں میں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ مثلاً تمیم داری، وہب بن منبہ اور کعب الاحبار وغیرہ ان میں سے زیادہ تر لوگ یمن کے اہل کتاب کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں تو آخر اس میں کیا راز ہے؟ اس نوع کے قصے کہانیاں حجاز کے یہودیوں کی بہ نسبت یمن کے یہودی ہی کیوں زیادہ تر بیان کرنے کے عادی تھے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یمن کا علاقہ —— جیسا کہ آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں —— حضارت اور تمدن میں حجاز سے بڑھا ہوا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یمن کے یہودی مدارس ان یہودی مدرسوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے جو حجاز کے یہودیوں نے حجاز میں قائم کر رکھے تھے —— تاریخی اعتبار سے ان یمنی مدارس کا وجود پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے —— اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ یمن میں یہودی ثقافت بہت زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے ہاں تورات کی شرحیں اور تاریخی قصوں کہانیوں کی کتابیں وغیرہ زیادہ متداول تھیں جو حجاز کے یہودیوں میں نہیں تھیں۔ جب یمن کے یہودی اسلام میں داخل ہوئے تو جو کچھ انھیں معلوم تھا اسے وہ بیان کرتے تھے اور ان کا مسلمانوں پر بڑا اثر ہوتا تھا۔

فلسفیانہ حرکت

تیسری علمی حرکت فلسفیانہ حرکت تھی۔ یہ علمی حرکت —— جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے سب دوسری حرکتوں سے کم تھی اور یہ بہت کم پھیل سکی —— فلسفی حرکت کا منظر —— ابتدائی زمانہ میں —— وہ سریانی مدارس تھے جو مملکت اسلامیہ میں مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے تھے —— جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں —— انہی سے مسلمانوں نے بھی فلسفہ سیکھا۔ اسی فلسفہ کے زیر اثر بعض دینی فرقوں کا ظہور عمل میں آیا جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہ بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خالد بن یزید بن معاویہ کو فلسفہ میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد میں بہت سے نصرانی اطباء کا اثر و رسوخ بھی خلفاء کے محلات میں کافی بڑھ چکا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ فلسفی اور طبیب ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کی طبی تعلیم و تدریس فلسفیانہ تعلیم و تدریس سے الگ نہیں ہوتی تھی۔ جیسا کہ بعینہٖ یہی صورت ہمیں بعد تک مسلمان فلاسفہ میں بھی نظر آتی ہے —— جیسا ابن سینا اور کندی —— ان اطباء میں سے جو اموی محلات شاہی میں خدمت پر مامور تھے۔ ایک ابن اثال طبیب تھا۔ یہ دمشق میں ایک نصرانی ڈاکٹر تھا جب امیر معاویہؓ خلیفہ ہو گئے تو انھوں نے اسے اپنے لئے منتخب کر لیا۔ وہ اس کی بہت خبرگیری کرتے رہتے تھے۔ اور انھیں اس پر بڑا اعتقاد تھا۔ رات دن اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ ویسے ہی عبد الملک بن ابجر کنانی جو ایک عالم اور ماہر طبیب تھا ابتداءً وہ اسکندریہ میں رہا کرتا تھا اور وہاں درس و تدریس کا منتظم تھا۔ لیکن جب اس علاقہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور اسکندریہ ان کے زیر اقتدار آگیا تو ابن ابجر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ہاتھوں پر اسلام لے آیا۔ حضرت عمرؒ اس زمانہ میں گورنر تھے۔ خلیفہ نہیں ہوئے تھے۔ ابن ابجر ان کے ساتھ رہا۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہو گئے تو اس نے بھی اپنا حلقۂ درس اسکندریہ سے انطاکیہ اور حران میں منتقل کر لیا۔ اور شام کے مختلف شہروں میں گھوما پھرا۔ عمر بن عبد العزیزؒ اسی سے علاج کراتے تھے اور فن طب میں اس پر بڑا ہی اعتماد فرماتے تھے۔

قفطی نے اخبار الحکماء میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں ماسرجویہ لبصرہ کے رہنے والا ایک طبیب تھا جو

اسرائیلی تھا۔ بعض لوگوں نے اس کا نام ماسرجیس بتایا ہے۔ یہ بھی طب کا بڑا عالم تھا۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے لئے فن طب میں اہرن پادری کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ کتاب عمدہ پرانی بھی کتابوں میں سے بہترین کتاب مانی جاتی تھی۔ ابن جلجل اندلسی نے نقل کیا ہے کہ ماسرجویہ ایک مسیحانی یہودی المذہب طبیب تھا۔ اس نے دولت مروانیہ میں مروان کے عہد میں پادری اہرن بن اعین کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس ترجمہ کو محل شاہی کی لائبریری میں پایا اور اسے نکالنے کا حکم دیا۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنی نماز پڑھنے کی جگہ پر رکھ لیا۔ اور خدا سے اس امر میں استخارہ کرتے رہے کہ کیا وہ اس کتاب کو مسلمانوں میں پھیلا دیں تاکہ وہ اس سے نفع اٹھائیں؟ اس امر میں وہ چالیس روز تک استخارہ کرتے رہے۔ اور بالآخر انھوں نے اس کتاب کو مسلمانوں کے لئے عام کر دیا اور اسے ان میں پھیلا دیا۔

ماسرجویہ کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے ایک کتاب "قوی الاطعمہ" ہے جس میں مختلف کھانے کی چیزوں کی قوتیں بیان کی گئی ہیں اور ان کے منافع اور نقصانات گنائے گئے ہیں۔ ایک دوسری کتاب "قوی العقاقیر" ہے جس میں جڑی بوٹیوں کے خواص، ان کی قوتیں اور منافع و نقصانات بیان کئے گئے ہیں۔

اس قسم کی چیزوں نے ایک تیسری علمی حرکت کو جنم دیا جسے ہم نے فلسفیانہ حرکت سے تعبیر کیا ہے۔ اسی میں وہ مناظرے اور مباحثے بھی شامل کئے جا سکتے ہیں جو آپ مسلمانوں اور نصاریٰ کے درمیان ہوتے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ یہ فلسفیانہ حرکت پہلی دو حرکتوں کی بہ نسبت بہت کم اور کمزور تھی۔

اس کے علاوہ یہاں ایک چوتھی حرکت بھی تھی جسے ہم ادبی اور لٹریری حرکت کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس کا موضوع ہماری اس کتاب کا خاص حصہ ہوگا جسے ہم وہیں بیان کریں گے۔

اسبابِ زوالِ اُمّت

(دوسرا ایڈیشن)

از پرویز

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟

ضخامت ۱۷۲ صفحات قیمت ۱۰ دو روپے

حقائق و عِبَر

۱۔ زندہ قوموں کے عزائم

اِس وقت تمام ممالکِ عالم میں، امریکہ وہ ملک ہے جو دولت کی کثرت اور سامانِ زیست کی فراوانی میں سب سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ان اشیاء کی اس قدر بہتات ہے کہ اب ان لوگوں کو اپنے لئے کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ لیکن کسی ایک مقام پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا، مضمحل، افسردہ یا مردہ قوموں کا شیوہ ہے۔ زندہ قومیں کبھی کسی مقام پر رک کر نہیں بیٹھتیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے ‌ ‌ ‌ ‌ تپد آن زمان دلِ من پئے خوبتر نگارے

ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے ‌ ‌ ‌ ‌ سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

چنانچہ انسان کی اس "فطرتِ ناصبور" کا مظہر ایک مختصر سا پمفلٹ ہے جو نیویارک کی ایک ایسوسی ایشن کی طرف سے شائع ہوا ہے جس کا نام ہے (TECHNOCRACY INC.) اس ایسوسی ایشن نے جو نصب العین اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کا تعارف ان کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ **معیارِ زیست:۔** امریکہ کے ہر باشندے کا معیارِ زیست دنیا میں سب سے اونچا ہوگا۔ اس میں وسائل و ذرائع پیداوار کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے گا۔ اور ہر فردِ معاشرہ تک سامانِ زیست بلا قیود و حدود، اور بلا تمیز آمدنی، بافراط پہنچا یا جائے گا۔

۲۔ **مکانات:۔** پوری آبادی کے لئے نئے ڈیزائن کے مکانات مہیا کئے جائیں گے۔ کسی کو کوئی مکان رہن نہیں رکھنا پڑے گا۔ کوئی ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ کسی قسم کی کوئی اقتصادی دقت نہیں اٹھانی پڑے گی۔

۳۔ **کام کرنے کے اوقات:۔** ان اوقات میں کمی کر کے رفتہ رفتہ اس سطح پر لایا جائے گا کہ کسی شخص کو ایک دن میں چار گھنٹے اور ہفتہ میں چار دن سے زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔

۴۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تازیست پوری آمدنی بطور پنشن دی جائے گی۔ یہ بڑھاپے کی پنشن نہیں ہوگی بلکہ ملک کے رزق کی فراوانی میں برابر کا حصہ ہوگا۔

۵۔ **تعلیم:۔** ہر ایک کو پچیس سال کی عمر تک، بلند ترین معیار کی تعلیم۔ اور اس کے بعد ٹیکنیکل تعلیم (مفت)

دی جائے گی۔

۶۔ صحت۔ ہر فرد معاشرہ کے لئے ہر قسم کی طبی امداد ہر وقت بلا قیمت میسر ہو گی۔

۷۔ آزادی۔ ہر شخص کو آزادی ہو گی کہ وہ اپنا فالتو وقت جس انداز سے جی چاہے گذارے۔ مذہب۔ اظہار خیالات کلچر، کھیل وغیرہ پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔

۸۔ مواقع۔ ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے اس امر کے یکساں مواقع موجود ہوں گے کہ وہ اپنی اپنی قابلیت کے مطابق جس مقام تک پہنچ سکتے ہیں پہنچ جائیں۔ ان کے راستے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔

۹۔ خیرات، کہ جس سے فرد کی خودی کو ٹھیس پہنچتی ہے، بالکل ختم کر دی جائے گی۔

۱۰۔ دولت۔ (MONEY) کو ختم کر دیا جائے گا اور جب اس کا وجود ہی نہ رہے گا تو قرضہ، ٹیکس۔ انشورنس وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

اس پروگرام کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ پروگرام بظاہر ایک شاعر کا حسین خواب نظر آئے گا۔ لیکن یہ ایسوسی ایشن اس خواب کو سچ کر دکھائے گی۔ اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل کر دے گی جس میں ہر انسان کو بافراط رزق ملے۔ وہ ہر خطرے سے محفوظ ہو اسے رزق اور امن کے لئے کسی قسم کی جگر پاش شقتیں نہ اٹھانی پڑیں۔

یہ ہیں عزائم زندہ قوموں کے۔ آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ دنیا زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کس طرح اس نقشے کے قریب پہنچ رہی ہے جو قرآن نے ابن آدم کے لئے اس دنیا میں مرتب کیا تھا۔ اگر ان قوموں کے پاس کہیں خدا کا پیغام بھی ہوتا تو وہ انسان کی طبعی زندگی کے لئے سامان کی فراوانی کے ساتھ اس کی ذات کی نشوونما کا بھی انتظام کر دیتیں۔

لیکن وہ ہم سے تو بہرحال آگے ہیں۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ

جاں بھی گرو غیر بدن بھی گرو غیر

۲۔ ایک نہایت مبارک تجویز

۲۶ اگست کے "آفاق" (لاہور) میں حسب ذیل اطلاع شائع ہوئی ہے۔

انجمن حمایت الاسلام کے صدر مولوی غلام محی الدین قصوری نے کہا ہے کہ ان کی انجمن مغربی پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ایسے "دارالامان" قائم کرنا چاہتی ہے۔ جہاں آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کی خواہش مند لڑکیاں اور عورتیں جو اپنی نادانی یا سادہ لوحی کی وجہ سے گناہ کی دلدل میں پھنس جاتی ہیں۔ پناہ لے سکیں اور اس طرح مناسب تربیت کے بعد اپنے آپ کو معاشرے کا مفید جزو بنا سکیں۔

مولوی غلام محی الدین قصوری نے جو آج شام ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے مجوزہ دارالامانوں کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ یہ دارالامان حکومت اور عوام کی امداد اور تعاون سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ایسی عورتوں کے لئے کوئی پناہ گاہ ہونی چاہیئے جو ساس نند کے جھگڑوں سے اکتا کر راہ فرار اختیار کر لیتی ہیں۔ یا شوہروں کے ظلم و ستم اور بیجا سختیوں کی تاب نہ لاکر گھروں سے نکل کھڑی ہوتی ہیں یا خاوند انھیں خود نکال دیتے ہیں۔ یا فاحشہ عورتیں ورغلا کر انھیں گھروں سے نکال لے جاتی ہیں اور پھر اوباش لوگوں کے سپرد کر دیتی ہیں جو تھوڑے عرصہ کے بعد ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ہوس دیدہ کے پتلے بدنصیب لڑکیوں کو سبز باغ دکھا کر لے جاتے ہیں اور جب اپنی ہوس کی تسکین کر لیتے ہیں تو انھیں اس طرح چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ گھر کی رہتی ہیں نہ گھاٹ کی اور اس طرح بے شمار لڑکیاں آبرومندانہ زندگی سے ہاتھ دھو کر غیر شریفانہ زندگی اختیار کر لیتی ہیں۔

مولوی صاحب نے کہا کہ جب اس قسم کی لڑکیاں پولیس کے ہاتھ آتی ہیں تو مجسٹریٹ صاحبان انھیں انجمن کے دارالشفقت میں بھجوا دیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ایسی عورتوں کو معصوم بچوں کے درمیان رکھنا کچھ پسندیدہ بات نہیں ہے مگر چونکہ یہ ایک بہت بڑا معاشرتی مسئلہ ہے اس لئے انجمن نے لاہور میں اور بعض دوسرے شہروں میں ایسے دارالامان قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جہاں ایسی بدنصیب عورتوں کو رکھ کر انھیں حالات کے مطابق یا تو واپس انھیں اپنے گھروں میں بھجوایا جائے گا۔ اور یا دستکاری سکھا کر اور مناسب تربیت دے کر انھیں ایک مرتبہ پھر معاشرہ کا مفید جزو بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

آپ نے کہا کہ دنیا کے ہر متمدن ملک میں ایسے تربیتی ادارے قائم ہیں۔ جہاں اس قسم کی لڑکیوں کو ڈھونڈ کر لایا جاتا ہے۔ اور ان کی مناسب تربیت کی جاتی ہے۔ ہم پاکستان میں بھی ایسے ہی دارالامان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے اس سلسلہ میں عوام اور حکومت سے تعاون کی اپیل کی ہے۔

یہ تجویز کسی تائید کی محتاج نہیں۔ نہ ہی جو کچھ ہمارے معاشرہ میں عورتوں کے ساتھ ہو رہا ہے وہ وضاحت طلب ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے پیش نظر بھی چند ضمنی تجاویز ہیں جنھیں ہم ارباب متعلقہ کی خدمت میں پیش کریں گے لیکن اس کا مناسب وقت وہ ہوگا جب یہ اسکیم پروان چڑھنے کے لئے تیار ہوگی۔ سردست ہم تمام بہی خواہان ملت سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مبارک اور وقت کی اہم تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے انجمن سے ہر قسم کا تعاون کریں۔ ہم حکومت سے بھی پرزور سفارش کریں گے کہ وہ اس باب میں انجمن کی پوری پوری مدد کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے کام حکومت کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ان امور کو از خود سرانجام نہیں دے سکتی تو کم از کم ان اداروں کا ہاتھ بٹائے جو اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔

نقد و نظر

۱۔ اسلامی دستور اور اسلامی اقتصادیات کے چند پہلو

کتاب کے مصنف محترم نصیر احمد شیخ تعلیم کے لحاظ سے وکیل (ایم اے، ایل۔ ایل۔ بی) پیشے کے اعتبار سے (غالباً) کاروباری اور سیاسی مسلک کی رو سے انڈو پاکستان اسلام لیگ کے جائنٹ سکریٹری ہیں۔ لیکن ایک طرف انھیں اسلامیات سے گہری دلچسپی اور وابستگی ہے اور دوسری طرف اقتصادیات پر ان کی نگاہ کافی وسیع ہے۔ وہ پاکستان اکنامک ایسوسی ایشن کے سرگرم رکن ہیں۔ اسی اعتبار سے وہ ایسے موضوعات پر جن کا تعلق اسلام اور معاشیات سے ہے، مختلف جرائد و رسائل میں مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے (اسی قسم کے) پانچ مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا مضمون اسلامی دستور پاکستان سے متعلق ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ (ان کے تصور کے مطابق) پاکستان کا اسلامی دستور کس انداز کا ہونا چاہیئے (یہ مضمون ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا تھا) اس میں انھوں نے اسلام کے معاشی نظام کو خاص اہمیت دی ہے اور بتایا ہے کہ وہی دستور اسلامی کہلا سکتا ہے جس میں افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی بافراط اور بآسانی پوری ہوتی رہیں۔ دوسرا مضمون (پاکستان کے لئے تجارتی پالیسی) تیسرا (اسلام میں منفی شرح سود) اور چوتھا (اسلامی اصولِ رسد و طلب) مصنف کی اقتصادی معلومات اور اسلامی نقاطِ نظر کے عمدہ مظاہر ہیں۔ پانچواں مضمون (جو سب سے زیادہ مفصل ہے) اس قرآنی حقیقت کے اثبات کی کامیاب کوشش ہے کہ زمین پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ مضمون درحقیقت سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب (مسئلہ ملکیت زمین) کی تردید میں ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مودودی صاحب نہ تو اقتصادیات سے واقف ہیں اور نہ ہی ان کی نگاہ قرآنی نظام معیشت پر ہے۔

اپنے دیباچہ میں مصنف نے ان شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے پروفیسر زنجن سنگھ صاحب کا نام ہے جو مصنف کے کیمسٹری کے استاد تھے۔ ان سے مصنف نے زندگی کو نظم و ضبط سے گذارنے کا سلیقہ سیکھا اور اس نصیحت کو پلے باندھا کہ "اگر دولت ضائع ہو جائے تو کچھ ضائع نہیں ہوتا۔ اگر صحت ضائع ہو جائے تو تھوڑا سا نقصان ہوتا ہے۔ اور اگر اخلاق ضائع ہو جائے تو سب کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔" دوسری شخصیت سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی کی ہے جن سے انھوں نے اسلام کا مدلل اور سائنٹیفک مفہوم سمجھا۔ تیسرے شخص جن سے مصنف نے "اپنے موقف پر اڑے رہنا اور بے خطر وہ بات کہنا جس پر میں خلوصِ نیت سے ایمان رکھتا ہوں۔" سیکھا، وہ لندن کی ڈرم ہیلز

برادر کے ڈائرکٹر مسٹر ایل۔ سی۔ ڈلیسن ہیں۔ چوتھے (ان کے الفاظ ہیں) "جن کی تصنیفات اور ہفتہ وار لیکچروں نے اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے سمجھنے میں میری مدد کی، وہ علامہ غلام احمد پرویز ہیں۔ میں نے جب پہلی بار ان کی کتاب کے سرورق پر نظامِ ربوبیت کے اصول لکھے دیکھے تو میں دنگ رہ گیا کہ اس تاریک ماحول میں اتنا دلیر شخص بھی کوئی ہو سکتا ہے۔" پانچویں شخص "جنھوں نے میرے خیالات کی زنجیر کی آخری کڑی فراہم کی وہ علامہ مشرقی بانی خاکسار تحریک اور بانی انڈو پاکستان اسلام لیگ ہیں۔" اسی سے مصنف کے رجحاناتِ فکر و نظر کا پتہ چل سکتا ہے۔ کتاب کا مختصر سا دیباچہ مسٹر زاہد حسین (سابق) چیرمین، پلاننگ بورڈ کا تحریر فرمودہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دیباچہ انگریزی میں لکھا تھا جس کا ترجمہ اچھا نہیں ہوا۔

کتاب میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن سے ہمیں جزئی اختلاف ہے۔ مثلاً (ص ۲۲) پر سورۂ نحل کی آیت ۷۱ کا حسب ذیل ترجمہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔

> خدا نے روزی کے عطیات تم میں سے بعض کے اوپر دوسروں سے زیادہ عنایت کئے ہیں۔ جن کو زیادہ عطیات ملے ہیں وہ اپنے عطیات اپنے ماتحتوں کو نہیں لٹا دیں گے تاکہ وہ اس لحاظ سے ان کے برابر ہو جائیں۔

اس ترجمہ سے آیت کا مفہوم ہی بدل گیا (بلکہ الٹا ہو گیا) اسی طرح سورۂ نحل کی آیت ۹۳ کا یہ ترجمہ کہ "اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔" قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف لے جاتا ہے۔

ایک مقام پر انھوں نے لکھا ہے کہ اگر پاکستان کے دستور میں افراد کی ضروریات زندگی وغیرہ کے لئے ضروری تحفظات رکھ دیئے جائیں تو پھر اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ آپ اس بات پر لڑتے پھریں کہ مخلوط انتخاب ہو یا جداگانہ اور اقلیت کی نشستوں کا تحفظ کیا جائے اور انہیں ویٹو بھی دیا جائے۔ آپ کو خالص جمہوریت کی ضرورت رہتی ہے (ص ۳۲)۔ ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ خیال صحیح نہیں۔ قومیت کی تشکیل اور جمہوریت ایسے بنیادی مسائل ہیں جن کے متعلق قرآن اپنا مخصوص تصور رکھتا ہے۔ اس لئے ان سے کسی حالات میں بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ (ان موضوعات پر ہم طلوعِ اسلام میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں)

ص ۲۶ پر ایک عجیب سی بات نظر پڑی ہے۔ لکھا ہے

> پاکستان بننے کے چار سال بعد ۱۹۵۱ء میں جب جیمز اے مچنر نے مس جناح سے اپنی کتاب "وائس آف ایشیا" کے لئے انٹرویو کیا تو وہ کہنے لگیں۔ "مسلمان مذہب کا ایک بڑا لیڈر میرے بھائی کے پاس آیا تھا اور اس نے کہا تھا۔ قائدِ اعظم! تم نے وہ کام کیا ہے جو رسول اور قرآن بھی نہ کر سکا تم نے مسلمانوں کی وفاداری کو ایک آدمی کی شخصیت میں مرکوز کر دیا ہے۔ قائدِ اعظم وہ تھا!"

"مسلمان مذہب کے جس بڑے لیڈر" نے یہ بات کہی تھی۔ اس نے بڑی زیادتی کی تھی۔ اسی قسم کا غلو ہے جو انسان کو خدا بنا دیا کرتا ہے۔

قائد اعظم مرحوم کے کام کی اہمیت کے اظہار کے لئے اُسے اس قسم کے الفاظ ہرگز استعمال نہیں کرنے چاہیئے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پر قائد اعظم نے خود بھی اسے ڈانٹ دیا ہوگا۔

بہرحال کتاب مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ طباعت اور کتابت بھی اچھی ہے۔ ضخامت ۴۸۴ صفحات۔ قیمت مجلد چھ روپے۔ مصنف سے ۲۰ زیمان کوٹھاری چیمبرز، میکلوڈ روڈ۔ کراچی ۲ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

۲۔ حیاتِ سرورِ کائنات (دو جلدیں)

آج سے کچھ عرصہ پہلے کی دلی میں شرفا کا ایک خاص طبقہ تھا جو متانت، سنجیدگی، خوش خلقی، وضعداری، اصول پرستی اور وسعتِ قلب میں مشہور تھا۔ جب تقسیم ہند کے سلسلہ میں گلستانِ دلی اجڑا تو ان گلہائے شرافت و نجابت کی پتیاں ادھر ادھر منتشر ہو گئیں۔ ان میں چند پنکھڑیاں کراچی کی جھولی میں بھی آپڑیں۔ حیاتِ سرورِ کائنات کے مؤلف، ملا الواحدی انہی میں کی ایک شاداب پتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

واحدی صاحب ایک کہنہ مشق اور صاحبِ ذوق اہلِ قلم ہیں۔ یہ ہمارے قدیم معاشرے کی گود میں پلے اور تصوف کی فضاؤں میں پروان چڑھے۔ خواجہ حسن نظامی (مرحوم) کے ہم جلیس رہے ہے۔ رسالہ نظام المشائخ ان کے انہی رجحانات کا مظہر ہے۔ انہوں نے آج سے تین چار سال پہلے حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ (دو جلدوں) میں شائع کی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے پیشِ نظر ہے۔ حرفِ آغاز میں انھوں نے لکھا ہے کہ

> مضامین کی تیاری میں ان تین کتابوں سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔
>
> (۱) رحمۃ للعالمین۔ مصنفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری
>
> (۲) سیرت النبی۔ مصنفہ مولانا شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی
>
> (۳) معراجِ انسانیت۔ مصنفہ چوہدری غلام احمد پرویز

اس سے ظاہر ہے کہ کتاب قدیم اور جدید دونوں رجحانات کی حامل ہے۔ مثلاً معجزات، معراج، وحی خفی و جلی، احادیث کی دینی حیثیت، وغیرہ عنوانات قدیم معتقدات اور تصورات کے ترجمان ہیں۔ اس کے برعکس، اسلامی نظامِ معیشت کا باب یوں کہیئے کہ (پرویز صاحب کی کتاب) نظامِ ربوبیت کا ملخص ہے جس میں لکھا ہے کہ

> رزق کے سرچشمے کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہیں۔

اور

> اسلام میں دولت کا جمع رکھنا جرمِ عظیم ہے

نیز

> افراد قوم وملک کی صلاحیتوں کو نشوونما دینا اسلامی نظام کی ایسی ہی ذمہ داری ہے جیسی افراد قوم وملک کی روٹی کپڑے اور مکان کی فراہمی اسلامی نظام کے ذمہ ہے۔ افراد میں مسلم وغیر مسلم کی قید نہیں۔

واحدی صاحب کے ہاں قدیم نظریات کی موجودگی ایک بدیہی امر اور قابل فہم بات ہے۔ لیکن انھوں نے جس کشادہ نگہی اور فراخ حوصلگی سے جدید تصورات کو اپنایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان میں ابھی تک کس قدر زندگی اور توانائی ہے حالانکہ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے ہیں جہاں کسی قدیم عقیدہ یا نظریہ میں ذراسی تبدیلی بھی ہولناک زلزلہ بن کر دکھائی دیا کرتی ہے۔ یہ بات بھی خوبی کی ہے کہ جن مقامات میں انھوں نے دوسروں سے اختلاف کیا ہے۔ وہاں متانت اور سنجیدگی کو انھوں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ایسے مقامات میں وہ دلیل وبرہان سے کم واسطہ رکھتے ہیں اور جذبات کے زور پر زیادہ بہتے ہیں۔ مثلاً وہ اطاعت رسول کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

> میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ بزرگوں نے جس روایت کو صحیح تسلیم کرلیا ہے۔ وہ ایسی لاریب فیہ ہے جیسا قرآن۔ اسے ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا۔ ...... مجھے اختلاف فقط اس بات سے ہے کہ روایات کا نقد صحیح کیا جائے۔ روایات کو یک قلم حجت فی الدین نہ مانا جائے۔ اور تو اور یہ عالم ہے کہا جائے کہ حضور سرور کائنات کے قول وعمل سے تو واسطہ نہ رکھو۔ حضور قرآن کی تعمیل اپنی عقل کے مطابق کراتے تھے تو قرآن کی تعمیل اپنی عقل کے مطابق کرو۔ حضور کے قول وفعل کا تو قطعاً پابند نہیں ہے۔ امامت کے اعتبار سے تو حضور کا ہم پلہ ہے۔ جس طرح کسی غلط روایت سے حضور کی کسر شان ہوسکتی ہے اسی طرح یہ حرکت بھی حضور کی کسر شان کا موجب ہے۔ میں اسے انتہائی گستاخی سمجھتا ہوں۔ (جلد دوم ص ۱۲۲)

خط کشیدہ الفاظ مصنف کے اپنے ہیں۔ اس کے بجائے اگر ان لوگوں کا مسلک (جو حضور کی وفات کے بعد خلافت علیٰ منہاج نبوت کی اطاعت میں خدا اور رسول کی اطاعت سمجھتے ہیں) خود ان کے الفاظ میں بیان کردیا جاتا اور پھر اس پر تنقید کی جاتی تو یہ انداز علم وتحقیق کی میزان میں زیادہ وزنی ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ واحدی صاحب ان معاملات میں ذاتی تحقیق کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ چنانچہ وہ (ص ۱۲۴ پر) لکھتے ہیں

> ۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے صدق جدید میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا ایک خط چھپا ہے۔ حدیث کا وزن گھٹانے والوں کی کسی تحریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا گیلانی لکھتے ہیں "آخر مسلمان یا آدم کی اولاد کیا اس حد تک احمق بنائی جاسکتی ہے۔ کہ

نماز۔ روزہ۔ اور اس قسم کی دوسری عبادات کا پہلی۔ دوسری۔ تیسری صدیوں میں پتہ نہ تھا۔ بلکہ ایک ہزار سال سے ملاؤں نے مسلمانوں کے سر ان عبادتوں کو تھوپ دیا۔

اصل تحریر میری نظر سے نہیں گذری۔ لیکن مولانا گیلانی کے اشارے اور صدق جدید میں چھپنے کے بعد نظر سے گذرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ایسی عبارت ہے کہ جن صاحب نے اتنی بڑی جسارت کی ہے ان کے ساتھی بھی شاید اس حد تک ان کی ہمنوائی نہ کر سکیں۔ انھوں نے حدیث کے وزن کو گھٹانے کا کمال کر دکھایا ہے۔

یعنی واحدی صاحب کے نزدیک، مولانا گیلانی کا اشارہ، اور اس کا صدق میں چھپ جانا، ایسی محکم سند ہے جس کے بعد انہیں اصل تحریر دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حالانکہ وہ خود ایک ہی صفحہ پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ

بزرگ بیشک بزرگ تھے۔ مگر نبی و معصوم نہ تھے۔ ان سے غلطی کا ہو جانا مستبعد نہیں ہے۔

(جلد دوم ص ۱۲۳)

جی چاہتا تھا کہ واحدی صاحب جیسے ثقہ بزرگ اس سے زیادہ ذمہ داری سے کام لیتے۔ وہ صاحب تحریر کا نام دریافت کرتے پھر ان سے ان کی تصدیق کرتے۔ اور اس کے بعد ان کا نام لے کر اس کی تردید کرتے محض اشاروں کنایوں کو الزامات کا بنی بنا کر ان کی تشہیر کرنا معلوم کتنے ناکردہ گناہ بیگانوں کو غلط فہمیوں کا شکار بنا دینے کا موجب بن سکتا ہے۔ یہ انداز عام پراپیگنڈہ کرنے والوں کا ہے۔ اور انہی کو زیب دیتا ہے۔

کتاب میں بعض باتیں ایسی بھی آگئی ہیں جو علمی اعتبار سے بہت کمزور ہیں۔ مثلاً معجزات کے باب میں لکھا ہے۔

معجزوں کی تعداد بڑھانی ہے تو قرآن مجید اور حضورؐ کی سیرت پر غور و تدبر کر کے بڑھایئے۔

یہاں تک بات بالکل صاف اور صحیح ہے۔ لیکن اس سے آگے ہے۔

قرآن مجید کے ایک دعوے اللہ...... یعلم ما فی الارحام کا اعجاز بالکل نیا۔ پاکستان کے مشہور و معروف عالم مولانا احتشام الحق کی زبانی سنئے۔ کسی مسلمان ڈاکٹر نے مولانا احتشام الحق صاحب سے کہا کہ عکس ریز (X - RAYS) کے ذریعہ جسم کی ہر اندرونی چیز دیکھ لی جاتی ہے لیکن عکس ریز یہ نہیں بتا سکتا کہ عورت کے رحم میں کیا ہے، لڑکا یا لڑکی۔ عکس ریز سے بڑھ کر کوئی آلہ ایجاد ہو جائے تو وہ بھی یہ نہیں بتا سکے گا کیونکہ رحم کے اندر بچہ کی نشست اس طرح ہوتی ہے کہ اعضائے جنسی چھپے رہتے ہیں۔ اللہ...... یعلم ما فی الارحام کی صداقت کا یہ نیا ثبوت ہے۔ جو ڈاکٹر ہی پیش کر سکتا تھا (جلد دوم ص ۲۵۶)

معلوم نہیں یہ ڈاکٹر صاحب کون بزرگ ہیں جنھیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ عکس ریز ہڈیوں، دھاتوں اور ٹھوس چیزوں کا عکس ہی

آسکتا ہے۔ اس لئے اگر جنین کے اعضاء جنسی سامنے بھی ہوتے تو بھی ایکس رے ان کے متعلق کچھ نہ بتا سکتا۔ انھیں شاید معلوم نہیں کہ حال ہی میں امریکہ میں ایسے تجربات ہوئے ہیں جن سے وہ حمل کے تیسرے ماہ ہی جنین کی جنسیت کے متعلق معلوم کر لیتے ہیں۔ اب سوچئے کہ اگر "قرآن کی حقانیت" کے متعلق وہ دلیل جو اوپر بیان کی گئی ہے، امریکہ (اور یورپ) کے ان ڈاکٹروں کے علم میں آجائے تو وہ خدا اور قرآن کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے! یہی وہ باتیں ہیں جن سے اسلام غیروں کی نظروں میں اس طرح گر جاتا ہے۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ جنین کے متعلق اللہ کے سوا کوئی کچھ نہیں جان سکتا۔ وہ پوری آیت (جسکے چند الفاظ واحدی صاحب نے درج فرمائے ہیں) یوں ہے

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۔ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۔ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۳۱/۳۴)

یقیناً اللہ وہ ہے جس کے پاس علم الساعت ہے اور وہ مینہ برساتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ ارحام میں ہوتا ہے اور کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ اور کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ کس خطۂ زمین موت آئے گی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن باتوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ کسی متنفس کو ان کا علم نہیں ہو سکتا وہ فرد کا علم۔ اور موت کا علم ہے۔ جنین کے متعلق قرآن نے یہ نہیں کہا کہ اس کا علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اگر یعلم ما فی الارحام کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ما فی الارحام کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ تو قرآن کریم کی ان بے شمار آیات کا مفہوم کیا لیا جائے گا جن میں کہا گیا ہے کہ (مثلاً) ان اللہ یعلم ما فی السموات والارض۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ ارض و سمٰوٰت میں ہے۔ (ظاہر ہے کہ ارض و سما میں بہت کچھ ایسا ہے جس کا علم انسانوں کو بھی ہے) یا واللہ یعلم ما یصنعون۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں۔ (حالانکہ اس کا علم اللہ کے سوا اوروں کو بھی ہو سکتا ہے) کم از کم انھیں تو اس کا ضرور علم ہوتا ہے۔ جو ان کاموں کو کرتے ہیں۔ اس قسم کی آیات میں اللہ کے علاوہ دوسروں کے علم کی نفی نہیں کی گئی۔

اب دیکھئے کہ ایک آیت کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟ قرآن کے بارے میں انسان کو بڑا محتاط بننے کی ضرورت ہے۔

کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ جلد اول کی ضخامت ۴۳۰ صفحات اور قیمت سوا چار روپے ہے۔ دوسری جلد کی ضخامت ۳۵۰ صفحات اور قیمت ساڑھے تین روپے۔ پاکستانی معیار کے مطابق کتاب کی صوری حیثیت بھی اچھی ہے۔ ملا واحدی صاحب۔ (دفتر رسالہ نظام المشائخ) ۴۱ حبیب لائنز کراچی سے (غالباً) مل سکتی ہے۔

سب کی پسند
مسواک
دانت برش
دانت پیسٹ
MISWAK
Tooth Paste
MAKES
TEETH
PEARLY
WHITE

(صفحہ ۴۴ کا بقیہ)

تیر ترکش پیکانِ یک کیشیم ما
یک نما یک بیں یک اندیشیم ما

ہم ایک ہی ترکش کے تیر ہیں جن کے پیکاں بہت اچھے ہیں۔ ہمارا نصب العین ایک نگاہ ایک۔ فکر ایک۔ تصور ایک۔ راستہ ایک۔ منزل ایک۔

مدعائے ما۔ مآلِ ما یکیست
طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست

ہمارا مدعا ایک۔ منتہیٰ ایک۔ طرز و اندازِ خیال ایک۔

ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یک جا شدیم

یہ خدا کی نعمت۔ یعنی وحیٔ الٰہی اور دینِ خداوندی ہے جس کی بنا پر ہم سب ایک دوسرے کے بھائی بن گئے ہیں۔ (فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا)۔ اور ایسے بھائی کہ ہماری زبان۔ دل اور جان تک ایک ہیں۔

یہ ہے وہ توحید جو ہماری تشکیلِ ملّت کے لئے اساس اولین ہے۔

تصحیح

طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۵۷ء کے صفحہ ۵۰ پر اس فقرہ میں۔
"ہندوستان کے بوہرے بھی اسمٰعیلی نزاری کی ایک شاخ ہیں۔"
نزاری کا لفظ حذف کر دیجئے۔

(مدیر طلوع اسلام)

اسے نوٹ کر لیجئے

طلوع اسلام کا اگلا پرچہ (بابت نومبر) کنونشن نمبر ہوگا۔ چونکہ اس میں کنونشن کی روئداد بھی شائع ہوگی اس لئے ہو سکتا ہے کہ پرچہ کی اشاعت میں دو چار روز کی تاخیر ہو جائے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

ایک درخواست

معاونین طلوع اسلام سے التماس ہے کہ میں غریب آدمی ہوں۔ اگر کوئی صاحب میرے نام پر ماہنامہ طلوع اسلام کا چندہ ادا کر کے جاری کرا سکے اور ادارہ کی کتب جتنی بطور خیرات دے سکے تو ازحد مشکور ہوں گا۔ میں اپنا نام اور پتہ طلوع اسلام میں شائع نہیں کرانا چاہتا۔ میرا نام صرف اتنا کافی ہے۔

(الف) معرفت طلوع اسلام۔ کراچی

قرآنی انقلاب کا صحیح تصور

ان کتابوں سے پیدا ہو سکیگا

معراجِ انسانیت حضور صلعم کی ذاتِ اقدس و اعظم شرف مجد انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھی۔ اسے قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرتِ مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم سب سے پہلے انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات، ملائکہ، وحی، شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کے لئے سلسلہ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

جوئے نور کاروانِ نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضراتِ انبیائے کرام از نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکارِ جلیلہ پر تفصیلی کتاب سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت دس روپے

سلیم کے نام خطوط مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوسِ گم گشتہ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے۔ اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب۔ بڑے سائز ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نظامِ ربوبیت نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقلِ انسانی نے کیا سوچا اور قرآن نے اس کا کیا حل بتلایا ہے۔ دورِ حاضر کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ۴۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

اسبابِ زوالِ امت (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز صاحب کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۱۵۹/۳-ایل پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۲۹

Starlit
TRADE MARK
TYPEWRITER RIBBONS
GEM CLIPS
PAPER FASTENERS
STAPLES
THUMB TACKS
PINS
پورے پاکستان میں
عام اسٹیشنری صرف یہی فیکٹری تیار کر رہی ہے
اس کی مصنوعات آپ کا اپنا قومی سرمایہ ہیں
MADE IN PAKISTAN
GEN[illegible]RAL STATIONERS LTD
MANGHOPIR ROAD KARACHI
اب غیر ملکی عام اشیائے اسٹیشنری کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے
کیونکہ ہم نے مال کے بنانے میں اسی خوشنمائی پائیداری اور معیار کو ملحوظ رکھا ہے جو انگلینڈ جرمنی اور امریکہ وغیرہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ قومی ترقی کا انحصار ملک کی مصنوعات کو استعمال کرنے پر ہے۔
جنرل مینیجر:- جنرل اسٹیشنرز لمیٹڈ

سلسلۂ اصلاح و تذکیر

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کیمتعلق قرآن کی تعلیم

(۱۳)

[اس مضمون کی گذشتہ گیارہ اقساط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ۔ والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ۔ بھائی بہنوں کو آپس میں اور میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ۔ نیز قرابت داروں کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم کس طرح پیش آنا چاہیئے اور ان کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ بارھویں قسط میں یہ بتایا گیا کہ عام مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق و واجبات ہیں؟ یہ بیان ہنوز جاری ہے۔ طلوع اسلام]

مسلمانوں کے باہمی تعلقات

جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں وہ بھی تمہارے بھائی ہیں

جو نسلیں تم سے پہلے گذر چکی ہیں وہ بھی تمہارے بھائی ہیں۔ وہ چونکہ مر چکے ہیں اس لئے تم ان کی کوئی مدد تو نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کے لئے اپنے دلوں میں نیک خواہشات اور بہتر آرزوئیں تو رکھ سکتے ہو۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے دلوں میں نیک خواہشات رکھو اور اپنے خدا کے سامنے ان خواہشات کا اظہار کرتے رہو۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۵۹)

جو لوگ ان کے بعد آئے ہیں وہ گذشتہ نسلوں کے متعلق بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا رہتے ہیں کہ اے

پروردگار ہمیں سامانِ حفاظت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ذرا بھی کھوٹ نہ رکھ۔ اے ہمارے پروردگار تو بلاشبہ بڑا صاحب کرم اور بڑا ہی مہربان ہے۔

بہرحال مسلمان کوئی بھی ہو، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، نومسلم ہو یا یتیم، اس کے باپ دادا کا نام تمہیں معلوم ہو یا نہ ہو جب وہ مسلمان ہے تو تمہارا بھائی اور تمہارا دوست ہے۔ مسلمانوں کو باہم اسی طرح رہنا چاہیئے جس طرح بھائی بھائی رہا کرتے ہیں۔ آپس میں اتحاد و اتفاق اور یگانگت و یکجہتی کے ساتھ انھیں رہنا چاہیئے۔ وہ مسلمان اس لئے ہیں کہ انھوں نے قوانین خداوندی سے اپنی وابستگی کا اقرار کیا ہے۔ اور انھوں نے ان اوامر و احکام کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا عہد کیا ہے جو خدا کی طرف سے ان پر نازل کئے گئے ہیں۔ لہٰذا انھیں خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر اتفاق کے ساتھ رہنا چاہیئے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۚ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (۳/۱۰۳)

اور خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں اختلاف نہ کرو۔ اور خدا کی اس نعمت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر خدا نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ گھلا ملا دیا چنانچہ خدا کے اس انعام کی وجہ سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔

یہ ضرور ہے کہ جب دو برتن ایک جگہ ہوتے ہیں تو وہ بعض اوقات کھڑک بھی جاتے ہیں۔ اسلئے کسی وقت کسی معاملہ میں باہمی تنازعہ پیدا ہو جانا ناممکن نہیں۔ لیکن اس تنازعہ کو باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ اگر دو مسلمانوں میں ایسی صورت پیدا ہو جائے تو معاشرے کا یہ فرض ہے کہ وہ فوراً ان بھائیوں میں مصالحت کرائے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (۴۹/۱۰ ؛ ۴۹/۱۱)

تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان (اگر بھگڑا ہو جائے تو) اصلاح کی کوشش کرو۔ اور خدا کے قوانین کی برابر نگہداشت کرتے رہو۔ توقع ہے کہ اس طرح تمہاری نشوونما ہوتی جائے گی۔

یہ فریضہ افراد ہی سے متعلق نہیں ہے۔ اگر کبھی دو جماعتوں میں اسی قسم کا تصادم پیدا ہو جائے۔ تب بھی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان دونوں جماعتوں میں صلح کرائے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی جماعت زیادتی پر اصرار کرے تو معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ اس جماعت سے جو زیادتی پر اصرار کر رہی ہے۔ جنگ کرے۔ حتیٰ کہ وہ احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ
بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ
أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ
اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۔ (۴۹/۹)

اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں برسرپیکار ہو جائیں تو تم ان کے درمیان صلح کرا دو۔ اگر ان میں سے ایک جماعت دوسری پر زیادتی کرے تو تم اس جماعت سے جنگ کرو جو زیادتی کر رہی ہے۔ تا آنکہ وہ خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ سو اگر وہ لوٹ آئے تو تم ان دونوں جماعتوں میں انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل و انصاف کو قائم کرو۔ یقیناً اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو عدل و انصاف کو قائم کرنے والے ہوتے ہیں

کیونکہ جو لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ وہ صرف اپنا نقصان ہی نہیں کرتے بلکہ پورے معاشرے کو نقصان پہنچاتے بلکہ تباہی اور بربادی کے کنارے پہ پہنچا دیتے ہیں۔ کیونکہ باہمی اختلاف کا نتیجہ بزدلی اور کمزوری ہے۔ اور اس کے بعد اقوام عالم میں ان کی کوئی ساکھ باقی نہیں رہتی۔ اغیار بڑی آسانی سے دبا لیتا ہے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ
وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (۸/۴۶)

خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے رہو۔ اور آپس میں جھگڑو نہیں کہ ایسا کرنے سے تم کمزور ہو جاؤ گے، اور تمہاری ساکھ جاتی رہے گی۔ اور ثابت قدم رہو۔ یقیناً خدا ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

سطور بالا میں آپ نے دیکھ لیا کہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہنے کی کس قدر تاکید کی گئی ہے۔ اور اختلاف و افتراق سے کس قدر تاکید کے ساتھ روکا گیا ہے۔ اختلاف و افتراق کی نہایت گھناؤنی شکل خود دین میں اختلاف اور افتراق پیدا کرنا ہے جو شدید ترین جرم ہے۔ قرآن کریم جو افراد اور جماعتوں میں اختلافات کو پسند نہیں کرتا وہ خود دین میں اختلاف و افتراق کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی شدید مذمت کی ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک دین میں اختلاف پیدا کر کے فرقے فرقے بنا ڈالنا شرک ہے۔ یہ جرم اتنا سنگین ہے کہ رسول اللہ صلعم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھیں۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ
إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (۶/۱۶۰)

جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ ڈالتے ہیں اور اس طرح فرقے فرقے بن جاتے ہیں۔ (اے پیغمبر اسلام) تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ خدا کا حوالے ہے۔ پھر وہی انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے تھے

کیونکہ دین میں فرقے بنا ڈالنا مسلمانوں کا کام نہیں بلکہ مشرکین کا کام ہے۔ اگر دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ خدا کے احکام کی اتباع اور پیروی کی جائے تو اختلافات پیدا ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکتی۔ خدا کی کتاب میں کہیں اختلاف نہیں۔ اس کے تحت اختلافات پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ اس کا کام اختلافات کو مٹانا ہے۔ اختلافات کو پیدا کرنا نہیں ہے۔ اختلافات اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ دین میں خدا کی کتاب کے ساتھ کچھ اور چیزوں کو بھی شریک کر لیا جاتا ہے۔ اور اسی کا نام شرک ہے۔

.... وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

تم مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین میں گروہ بنا لئے اور فرقے بن گئے۔ اور ہر فرقہ اپنے معتقدات پر شاداں و فرحاں اور مطمئن ہے (کہ بس وہی راہِ راست پر ہے۔ اور باقی سب گمراہ ہیں)

اتنا ہی نہیں کہ دین میں فرقے بنا ڈالنا یا آپس میں اختلاف پیدا کر لینا مشرکانہ روش ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ شرک کو تو کچھ عرصہ کے لئے گوارا بھی کر لیا جا سکتا ہے مگر باہمی افتراق و اختلاف اور فرقہ بندی کو تھوڑے سے عرصہ کے لئے بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب کوہِ طور سے واپس آ کر بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی میں گرفتار پایا ہے۔ اور غصہ سے بے تاب ہو کر انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو زجر و توبیخ کیا ہے تو انہوں نے (جو خود ایک اولوالعزم پیغمبر ہیں) جواب میں فرمایا تھا۔

قَالَ يَا ابْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ۝ (۲۰/۹۴)

ہارون نے کہا۔ میرے ماں جائے بھائی! میری ڈاڑھی اور میرے سر کے بال تو نہ پکڑ۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تم کہو گے کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا خیال نہیں رکھا۔

ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے قوم بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کو بھی جو صریحاً شرک تھی وقتی طور پر گوارہ کر لینا پسند فرمایا۔ مگر یہ کہلوانا گوارا نہیں کیا کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ یعنی تفرقہ اندازی اتنا سنگین جرم ہے کہ اس کے مقابلہ میں وقتی طور پر شرک بھی گوارا کیا جا سکتا ہے۔

ظن سے احتراز کرو

لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں افتراق و اختلاف اور پارٹی بندی اور فرقہ پرستی کے جراثیم نشوونما نہ پا سکیں تو یہ محض ایسا خواہش کر لینے سے نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے لئے ہمیں کچھ کرنا بھی ہوگا۔ اپنے جذبات و رجحانات پر کچھ پابندیاں عائد کرنی ہوں گی۔ ان اسباب و ذرائع سے اپنے آپ کو بچانا ہوگا جو باہمی اختلاف و افتراق کا موجب بنتے ہیں۔ ان وجوہ سے محترز رہنا ہوگا جو باہم بداعتمادی کا سبب بنتی ہیں۔ باہمی اختلاف و افتراق کی ایک بڑی بنیاد گمان پکا لینے کی عادت بھی ہے۔ جہاں کسی کے متعلق ہمارے دل میں کوئی بدگمانی پیدا ہوئی ہمارے دل میں اس آدمی

کی طرف سے کھٹاس آگئی۔ اب اس سے سیدھے منہ بات کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی اور رفتہ رفتہ یہ بدگمانی ایک امر واقعہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ پھر اس کی بنیاد پر آدمی وہ کچھ کرگذرتا ہے جو شاید اس کے بغیر کبھی نہ کرسکتا۔ شدہ شدہ حالت یہ ہوجاتی ہے کہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور عزت وآبرو کا لاگو بننے سے بھی نہیں شرماتا۔ حالانکہ جب تحقیق حال کی جاتی ہے تو اس ساری دشمنی کی بنیاد محض چند بدگمانیاں نکلتی ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک مسلمان اس قسم کی بدگمانیوں سے جہاں تک ہوسکے اپنے دامن کو محفوظ رکھے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ
بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ٥ (۴۹/۱۲)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! گمان پالنے سے بے انتہا بچو اور احتراز کرو۔ یقیناً بعض گمان ایسے ہوتے ہیں جو پسماندگی کا باعث ہوتے ہیں۔

غیبت نہ کرو

ساتھ ہی ہمیں غیبت سے بھی احتراز کرنا چاہیئے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جہاں دو چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں، وہاں دنیا بھر کے جھگڑے چکائے جانے لگتے ہیں۔ پھر ایک ایک کے عیب گنوائے جاتے ہیں لوگوں کی بُرائیاں کی جاتی ہیں۔ پھر ان میں سے بعض ایسے بدخصلت بھی نکل آتے ہیں جو یہاں سے اٹھ کر ان لوگوں کی مجلس میں جاتے ہیں جن کی یہاں بُرائیاں کی جارہی تھیں اور ایک ایک کی سو سو بنا کر بیان کرتے ہیں کہ آپ کو فلاں آدمی یہ کہہ رہا تھا اور فلاں یہ۔ ظاہر ہے کہ جب یہ باتیں ان لوگوں تک پہنچتی ہیں جن کی برائیاں، اور عیوب شماریاں کی گئی تھیں تو ان کے دل بھی کینیدگی کا شکار ہوجاتے ہیں اور شدہ شدہ یہ کبیدگی دشمنی کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ قرآنی معاشرہ میں ہر مسلمان کو اس کی پابندی بھی کرنی چاہیئے کہ کسی کو اس کی پیٹھ پیچھے بُرا بھلا نہ کہا جائے۔ عیب ہر انسان میں ہوتے ہیں۔ وہ کونسا آدمی ہے جس میں کوئی نقص نہ ہو۔ ہم میں خود بھی تو ہزاروں عیب اور نقائص ہیں۔ دوسروں کی عیب چینی کے بجائے ہمیں خود اپنی اصلاح کی طرف توجہ دینی چاہیئے ہمارے عیوب و نقائص تو ہر وقت ہمارے سامنے ہیں ہم جس قدر اپنے عیوب سے واقف ہوسکتے ہیں دوسروں کے نقائص سے واقف نہیں ہوسکتے۔ حیرت کا مقام ہے کہ انسان اپنے عیوب اور نقائص سے آنکھیں بند کرکے دوسروں کے عیوب کے پیچھے کس طرح پڑجاتا ہے پھر ہمیں دوسروں کے دس پانچ عیب ہی معلوم ہوں گے مگر اپنے تو بیسیوں عیب معلوم ہیں۔ اور علم الیقین کے ساتھ معلوم ہیں جبکہ دوسروں کے عیوب کے متعلق ہمیں یہ علم الیقین بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ مگر اس کے باوجود اپنی ناک کا شہتیر ہمیں نظر نہیں آتا۔ اور ہم دوسروں کی آنکھوں کے تنکوں پر سینہ کوبی کرتے رہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہم تو اظہار واقعہ کرتے ہیں ہم لوگوں کی طرف غلط عیوب منسوب نہیں کرتے۔ سچ بات کہہ دینے میں کیا مضائقہ ہے۔ مگر شاید انہیں معلوم نہیں کہ غیبت اسی عیب چینی کو کہتے ہیں جو سچی ہوتی ہے۔ اگر وہ عیب چینی غلط ہو تو اسے غیبت نہیں بلکہ بہتان طرازی اور تہمت تراشی کہتے ہیں۔ جو غیبت سے بھی بدتر ہے۔ لہذا نہ تو انسان کو کسی کی غیبت کرنی چاہیئے اور نہ ہی

دوسروں کے عیب کی ٹوہ میں لگا رہنا چاہیئے۔

وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ ۝ (۴۹/۱۲)

اور دوسروں کے عیوب کی ٹوہ میں نہ لگے رہا کرو۔ اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو۔ کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے۔ اسے تو تم قطعاً ناپسند کرتے ہو (تو غیبت کرنا بھی تو بعینہٖ یہی کچھ کرنا ہے) خدا کے قانون کی برابر نگہداشت کرو۔ یقیناً خدا بڑا توجہ فرمانے والا اور مہربان ہے

ذرا اس مثال پر غور فرمایئے جو قرآن کریم نے غیبت کے سلسلہ میں پیش کی ہے۔ غیبت میں اسکے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ ایک بھائی کے پس پشت اس کے عیوب گنائے جاتے ہیں اور یوں اسے بے آبرو کر کے اس کے کپڑے اتارے جاتے ہیں۔ ایسا کرنے والوں میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ یہی باتیں وہ اپنے بھائیوں کے منہ پر کہہ سکیں۔ لہٰذا ان کے پس پشت ہونے کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ایسا کرنیوالوں کو غیبت کرنے سے کوئی محسوس و مشہود مفاد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑ لیتے ہیں۔ اب اس کے برعکس اس مثال پر غور کرو کہ جو قرآن کریم نے پیش کی ہے۔ بھائی مر گیا ہے۔ اس کا مردہ جسم آپ کے سامنے پڑا ہوا ہے۔ جس بھائی کا آپ کو لحاظ ہو سکتا تھا وہ تو اب اس جسم میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا پس پشت ہونے کا فائدہ اب بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ عیب چینی کرنے سے تمہارا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ محض دل کے جلے پھپھولے ہی پھوٹتے تھے۔ لیکن اگر تم اس بھائی کے جسم کا گوشت کھانا چاہو تو اس سے اپنا پیٹ بھی بھر سکتے ہو۔ اور اس طرح ایک محسوس و مشہود مفاد بھی حاصل کر سکتے ہو۔ مگر اس کے باوجود تم اسے تو پسند نہیں کرتے تو پھر اپنے بھائیوں کے پس پشت ان کی عیب چینیاں کیوں کرتے ہو؟ جس بھائی میں کوئی عیب تمہیں نظر آئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم علیحدگی میں اس کی توجہ اس طرف منعطف کراؤ اور اس کی اصلاح کی کوشش کرو۔

کسی کی طرف سے دل میں کھوٹ نہ رکھو

مسلمانوں کا مثالی معاشرہ تو وہی ہو سکتا ہے جس میں کسی ایک بھائی کے دل میں دوسرے بھائی کی طرف سے کھوٹ نہ پایا جائے۔ ہر مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان بھائی کے لئے بہی خواہی کے جذبات ہی پرورش پاتے ہوں۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ۝ (۱۵/۴۷)

اور ان کے دلوں میں جو کچھ ایک دوسرے کی طرف سے کھوٹ ہو سکتا تھا۔ وہ ہم نے ان سے دور کر دیا ہے۔ وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے سامنے چھپر کھٹوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

دوسری جگہ ہے

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ (۷/۴۳)

اور ان کے دلوں میں جو کچھ ایک دوسرے کی طرف سے کھوٹ ہو سکتا تھا وہ ہم نے ان سے دور کر دیا ہے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

حتیٰ کہ مسلمانوں کو دعا بھی یہ سکھائی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور اپنی ان آرزوؤں کا اظہار کیا کریں۔

وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۵۹/۱۰)

اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے کوئی کھوٹ نہ رکھ جو ایمان لا چکے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار بلاشبہ تو بڑا ہی شفقت و رحمت والا ہے۔

باہمی مودت مسلمانوں کے باہمی تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ محبت و مودت اور حسن سلوک اور شفقت کے ہونے چاہئیں۔ ان کے باہمی معاملات، معاشرتی حالات ہر چیز میں ان صفات کا مظاہرہ ہونا چاہیئے۔ ایک دوسرے پر غلبہ و اقتدار، تسلط و تحکم اور جبر و زبردستی کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ان چیزوں کا خود مسلمانوں کے درمیان مظاہرہ کرنا خود اپنی ہی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ مسلمان جب آپس میں ان خطوط پر سوچنا شروع کر دیں کہ ہم فلاں ملک، فلاں قوم فلاں صوبہ یا فلاں قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہم دوسرے مسلمانوں سے افضل اور بہتر ہیں۔ اور دوسرے مسلمان ہم سے فروتر اور کمتر ہیں۔ یا ہم چونکہ دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ تعلیم یافتہ یا زیادہ مہذب ہیں اس لئے ہمیں دوسرے مسلمانوں پر حکومت کرنے، اپنا تسلط و اقتدار قائم کرنے کا حق ہے تو اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو ملنے سے کمتر یا فروتر سمجھا جاتا ہے ان میں ادلاً احساس کمتری پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ برسر اقتدار گروہ سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور یہ نفرت اور بیزاری بتدریج انتقام کے شدید جذبات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر یہ دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامیابی کسی گروہ کو بھی حاصل ہو بہرحال مسلمانوں کی جمعیت پارہ پارہ ہو جاتی اور ان کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بغض و عناد کے بیج بو دیئے جاتے ہیں۔ جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کی تباہی اور نکبت و زوال کے دن دور نہیں ہے بلکہ سر پر آ لگے ہیں۔

مسلمانوں کے اس معاشرہ میں جو قرآنی خطوط پر قائم ہو یہ صورت قطعاً نہیں ہو سکتی وہاں تو یہ صورت ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ

عَلَيْهِمْ (۵/۵۴)

اے پیروانِ دعوت ایمانی! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جانا چاہے (تو پھر جائے) خدا عنقریب (ان کی جگہ) ایک ایسی قوم لے آئے گا جنہیں خدا دوست رکھتا ہوگا۔ اور وہ خدا کو دوست رکھتے ہوں گے۔ وہ مومنین کے سامنے جھکے ہوئے رہیں گے۔ اور کافرین کے مقابل میں غلبۂ اقتدار کے پیکر۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے یہ تو خدا کا فضل ہے جو وہ اسی کو دیتا ہے جو اسے لینا چاہتا ہے۔ اور خدا بڑی وسعتوں والا اور بڑے علم والا ہے۔

قرآن کریم نے رسول اکرم صلعم کے اصحاب (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے رحمت و رأفت کا مجسمہ ہوتے تھے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے رفیق ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ کفار کے مقابلہ میں وہ نہایت سخت گیر واقع ہوئے ہیں لیکن آپس میں وہ رحمت و رأفت کا زندہ پیکر ہیں۔

لہٰذا قرآنی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے معاشرے میں ان کے باہمی تعلقات محبت و مساوات اور رحمت و رأفت کے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۹/۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار اور دوست ہوتے ہیں۔

برق طور

از:- پرویز

استبداد و ملوکیت کے مجسمہ فرعون۔ پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کے پیکر ہامان اور سرمایہ داری کی خون آشامیوں کی تمثیل۔ قارون کے متحدہ محاذ کے خلاف صاحب ضرب کلیم کی نبرد آزمائی اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی بصیرت افروز اور عبرت انگیز داستان

قیمت:- چھ روپے

چند بصیرت افروز کتابیں

جشن نامے
ہم ہر سال جشنِ جمہوریہ منانے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ مگر کیا ہر جشن اسی طرح منایا جائے گا جیسے ہم ہر سال مناتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم نشاں درد انگیز تصویر۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے

مزاج شناسِ رسولؐ
پیشوایانہ ڈکٹیٹرشپ کی راہیں کس طرح ہموار کی جا رہی ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھیے تاکہ جماعتِ اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آ جائے۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث (جلد دوم)
حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ حدیث کی تاریخ۔ منکرینِ حدیث کون ہیں؟ غرضیکہ احادیث کے متعلق اتنی وسیع معلومات آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ پہلی جلد ختم ہو چکی ہے۔ قیمت جلد دوم۔ چار روپے

قرآنی فیصلے
روزمرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں؟ دین کے متعلق پُر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

قرآنی دستورِ پاکستان
اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور جماعتِ اسلامی کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے

اسلامی نظام
اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اسکے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے مقالات کا مجموعہ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۸۰ صفحات قیمت دو روپے

نوادرات (از: علامہ اسلم جیراجپوری)
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ
بڑا سائز ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت (از پرویز) (زیر طبع)
(تیسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات بالخصوص عورتوں، بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس سے بہتر کتاب آپکو نہیں ملیگی۔ قیمت دو روپے

اقبال اور قرآن (از: پرویز)
علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ: ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل، پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۲۹

پیشگی خریداران

یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا تھا۔ گذشتہ چار سال میں اکثر و بیشتر زرِ پیشگی کے عوض مطبوعاتِ ادارہ دی جا چکی ہیں۔ اور متعلقہ کھاتوں میں یا تو کچھ باقی ہی نہیں رہا ہے یا آمد سے خرچ زائد ہو چکا ہے۔ زائد خرچ کی ادائیگی کے لئے فرداً فرداً یاد دہانی کرائی جا چکی ہے۔

زرِ پیشگی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں قابل قدر مدد ملی ہے اسلئے اس سلسلہ کا جاری رکھنا بہر وجوہ مستحسن ہے۔ توقع ہے کہ جن اصحاب کا زرِ پیشگی ختم ہو چکا ہے، وہ مزید ایک سو روپے یکمشت یا باقساط ارسال فرما کر اس مفید کام میں ضرور حصہ لیتے رہیں گے۔

قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب جو تا حال پیشگی خریدار نہیں بنے ہیں ان کی توجہ اس مفید سلسلے کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے تاکہ وہ اس میں جلد از جلد شامل ہو جائیں۔

پیشگی خریدار بن کر آپ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں معتدبہ امداد کچھ خرچ کئے بغیر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس اسکیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک سو روپے کی رقم ادارہ کے پاس جمع کرا دیں۔ ادارہ اپنی مطبوعات (جنھیں آپ لینا پسند کریں) آپ کو گھر بیٹھے پہنچاتا رہیگا اور محصول ڈاک بھی اپنے پاس سے ادا کرے گا۔ اس طرح آپ کو آپ کے جمع کردہ روپے کی کتابیں (بلا محصول ڈاک) مل جائیں گی۔ اس میں ہمارا فائدہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں کچھ رقم پیشگی مل جاتی ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے
MISWAK
چھوٹا مسواک ہر چھوٹی اور بڑی دوکان پر ملتا ہے